Regd. No. 7243

Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جنوری 1985

اس پرچہ میں

عورت — قرآن کے آئینے میں

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ 4 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون :- ۸۸۰۸۰۰	بدل اشتراک
۴	خطوکتابت	سالانہ
چار روپے	ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵- بی گلبرگ ۲ لاہور	پاکستان /۴۸ روپے
		غیر ممالک /۹۸ روپے

شمارہ ۱	جنوری ۱۹۸۵ء	جلد ۳۸

فہرست

(۱) لمعات ——————— ۲

(۲) عورت قرآن کے آئینے میں ——————— ۲۱

(۳) قائد اعظمؒ اور دو قومی نظریہ ——— (پرویز صاحب) ——— ۴۶

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر شیخ عبدالحمید، مقام اشاعت ۲۵- بی گلبرگ ۲ لاہور - مطبوعہ اشرف پرنٹنگ پریس ۹- ایبک روڈ لاہور

لمعات

قرآنِ کریم کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ اس نے وسیع و عریض کارگہِ کائنات کے حقائق اور نفسِ انسانی کے عمیق و دقیق رموز و اسرار، ایسے مرتکز (CONCENTRATED) انداز سے بیان کئے ہیں کہ اس کے ایک ایک قطرے میں سمندر سمویا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسے جامع صحیفۂ کائنات، اور مکمل ضابطۂ حیات کی ضخامت اتنی مختصر ہے کہ اگر اسے انگریزی زبان کے باریک ٹائپ میں چھاپا جائے تو چند اوراق میں قلمبند ہو جائے۔ اس کے حیرت انگیز انداز کی ایک مثال ملاحظہ فرمایئے۔

حضور نبی اکرمؐ نے عمر بھر، قرآنِ کریم کی انسانیت ساز تعلیم، قریش کے سامنے پیش کی اور انہوں نے اس کی جی بھر کے مخالفت کی۔ آخر الامر، آپؐ نے ان سے ایک دن کہا کہ میں عمر بھر تم سے تفصیلی گفتگوئیں کرتا رہا ہوں لیکن آج میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں ——— صرف ایک بات:۔

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ...... اے رسول! ان سے کہو کہ میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔

انہوں نے جی میں کہا کہ یہ صرف ایک بات کہنا چاہتا ہے۔ اس کے سن لینے میں کیا حرج ہے؟

انہیں اس طرح آمادہ پا کر آپؐ نے فرمایا کہ وہ بات ایسی معمولی نہیں کہ تم اسے یونہی چلتے چلتے سن لو۔ وہ بڑی اہم بات ہے اس لئے اسے کھڑے ہو کر دل کے کانوں سے سنو ——— سب نہیں تو ایک ایک، دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ...... جب آپؐ نے انہیں اس طرح نفسیاتی طور پر اپنی طرف متوجہ کر لیا تو فرمایا کہ میں جو بات تم سے کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ

ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ...... (34/46)

تم، سوچا کرو۔

اس ایک لفظ میں، قرآنِ کریم نے حقائق و رموزِ انسانی کی کتنی دنیائیں سمٹا کر رکھ دی ہیں، اس کا صحیح اندازہ وہی قومیں لگا سکتی ہیں جو عقل و فکر کی اہمیت سے واقف ہیں۔ ہمارے لئے تو اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ سارا قرآن، عقل و فکر اور غور و تدبر کی تاکید سے بھرا پڑا ہے، حتیٰ کہ اس نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے وہ انسان نہیں، حیوان ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گذرے۔ (7/179) یہ اہلِ جہنم میں سے ہیں۔ (7/179)۔

قرآنِ کریم نے یہ کہہ کر جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے، وہ انسان نہیں، بلکہ حیوانی سطح پر زندگی بسر

کرتے ہیں، نہ صرف فکرِ انسانی کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے بلکہ اس کی تخلیقی تاریخ کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔ قرآنی حقائق (اور عصرِ حاضر کے سائنٹیفک انکشافات) کی رُو سے زندگی (کسی خاص فرد یا نوع کی زندگی نہیں، بلکہ خود زندگی) اوّلیں جرثومہ حیات کے نقطہ آغاز سے، اپنی ارتقائی منازل طے کرتی، پیکرِ انسانی تک پہنچی ہے۔ اس کے اس سفر میں دو باتیں نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں، یعنی:-

تکرار ہی تکرار

(۱) جس نوع نے جس مقام پر کشمکشِ حیات سے منہ موڑ لیا وہ اسی مقام پر رک کر رہ گئی۔ آگے نہیں بڑھ سکی۔ اس کا مقصدِ حیات اپنے آپ کو دہرائے چلے جانا (REPRODUCTION) یا (REPITITION) رہ گیا۔ لاکھوں، کروڑوں سال سے چھپکلی اپنے جیسی چھپکلیاں پیدا کر کے ختم ہو جاتی ہے۔ بکری، اپنے جیسی بکری ہی پیدا کر سکتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، جب کوئی نوع ایک مقام پر رک جاتی ہے تو اس کی زندگی کی حرکت دوری (CYCLIC) رہ جاتی ہے، ارتقائی یا مراحلی (EVOLUTIONARY) نہیں رہتی۔ اور

(۲) ہر نوع جو آگے بڑھتی ہے اس میں، سابقہ نوع کے مقابلہ میں، دماغی استعداد کچھ زیادہ ہوتی ہے جب کوئی نوع کسی مقام پر رک جاتی ہے تو اس کی "ذہنی استعداد" بھی وہیں کی وہیں منجمد ہو کر رہ جاتی ہے۔

زندگی جب انسانی پیکر میں پہنچی تو اس کی "ذہنی استعداد" کو فکر سے تعبیر کیا گیا۔ فکری صلاحیت، خاصہ انسانیت ہے۔ حیوان اس سے محروم ہیں۔ یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے فکری صلاحیتوں کو کام میں نہ لانے والے انسانوں کو اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ط .... ($\frac{7}{179}$) کہہ کر پکارا ہے یعنی حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنے والے، بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ، کیونکہ حیوانات (کم از کم) اپنی جبلی صلاحیتوں (INSTINCT) سے تو کام لیتے ہیں!

سطحیں لوگ کہا کرتے ہیں کہ اگر نظریۂ ارتقاء صحیح ہے تو انسان کسی اور نوع میں تبدیل کیوں نہیں ہو گیا؟ وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ اب ارتقاء، جسموں اور پیکروں کے تغیر و تبدل کی شکل میں نمودار نہیں ہوتا۔ منزلِ انسانیت میں پہنچ کر، فکری ارتقاء کا آغاز ہوا

فکری ارتقاء

ہے اور اس ارتقاء کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ ذرا سوچئے کہ کیا لاکھوں سال پہلے کا غاروں میں بسنے والا انسان، اور چاند ستاروں کو مسخر کرنے والا آج کا انسان، فکری طور پر ایک ہی نوع کے افراد ہیں؟ آج کا انسان، غاروں میں بسنے والے انسان سے یقیناً ایک "مختلف نوع" کا انسان ہے۔

وحی کا مقصد، انسانی فکر کو جِلا دے کر، اس کی آماجگاہ کو وسیع سے وسیع تر کرتے چلا جانا ہے۔ جہاں تک فکری جِلا کا تعلق ہے، قرآنِ کریم شروع سے آخر تک، غور و تدبر پر زور دیئے چلا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ۝ ($\frac{47}{24}$)

یہ لوگ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ ان کے دلوں نے اپنے اوپر،

خود وضع کردہ تالے ڈال رکھے ہیں تاکہ ان کے اندر کچھ داخل ہی نہ ہو سکے۔

وہ ان لوگوں کو مومن ہی تسلیم نہیں کرتا جو عقل و فکر سے کام لئے بغیر، کسی بات کو یونہی سچا مان لیں۔ وہ مومنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝ (۲۵/۷۳)

یہ وہ لوگ ہیں کہ، اور تو اور، جب ان کے سامنے آیاتِ خداوندی بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ایسا نہیں کرتے کہ عقل و فکر کو بالائے طاق رکھ کر، اندھوں اور بہروں کی طرح ان پر گر پڑیں۔ وہ انہیں علم و بصیرت کی رُو سے تسلیم کرتے ہیں۔

جہاں تک انسانی فکر کے میدان کی توسیع کا تعلق ہے، وہ کہتا ہے کہ

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ط .... (۲/۲۱۹)

اس طرح اللہ تعالیٰ حقائق کو نمایاں طور پر سامنے لاتا ہے تاکہ دنیا اور آخرت، دونوں کی زندگی پر غور و فکر کر سکو۔

انسان کو فکری صلاحیت عطا کر کے، اسے حیوانات سے ممتاز کر دیا۔ اور، اُخروی زندگی کو فکر کے دائرے میں شامل کر کے، مومن اور کافر میں امتیاز کر دیا۔ لہٰذا الدّین (اسلام) نام ہے، دنیا اور آخرت کی زندگی میں غور و فکر سے کام لینے کا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ سلسلۂ ارتقاء کی رُو سے، انسان کی فکری صلاحیت بڑھتی اور بلند ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے کسی ایک دور (زمانہ) کی فکری سطح حرفِ آخر نہیں قرار پا سکتی۔

دین یہ کچھ کرتا ہے۔ اس کے برعکس مذہب، کسی ایک زمانہ کی فکری سطح کو حرفِ آخر قرار دے کر، اسے وہیں منجمد کر دیتا ہے۔ اس سے انسانی زندگی، حیوانی سطح (کالانعام) پر پہنچ جاتی ہے اور اس کا مقصد (آگے بڑھنے کے بجائے) تکرار (REPETITION) رہ جاتا ہے۔ یعنی جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے اسے ابدی طور پر غیر متبدّل قرار دے کر، اس کی ہو بہو نقل کرتے رہنے کو مقصدِ حیات سمجھ لینا۔ اسے مذہب کی اصطلاح میں تقلید کہتے ہیں۔ قلادہ اس رسی یا طوق کو کہتے ہیں جسے مویشیوں کے گلے میں ڈال دیا جاتا ہے، اور اس سے مویشی کو جدھر جی چاہے چلایا جاتا ہے۔ غور کیجئے کہ معانی کے اعتبار سے بھی تقلید سے انسان کی پوزیشن کیا ہو جاتی ہے۔ چونکہ تقلید (مذہب) کا مدار عقل و فکر پر ہوتا ہی نہیں، اس لئے اس میں سوچ کو حرام قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہزاروں سال پہلے کی انسانی فکر اس قابل ہوتی ہی نہیں کہ وہ اتنے زمانے بعد کی فکر کو دلائل سے مطمئن کر سکے۔ بجائے اس کے کہ مذہب اس حقیقت کا اعتراف کرے، وہ سرے سے غور و فکر ہی کو حرام قرار دے دیتا ہے۔ اس خود فریبی یا ابلہ فریبی سے وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنے مسلک کو "الحاد و بے دینی" کے حملوں سے محفوظ کر لیا ہے۔ اگر کہیں سے دلیل طلبی کی آواز اٹھتی ہے تو وہ عوام کے جذبات کو یہ کہہ کر مشتعل

کر دیتا ہے کہ یہ شخص تمہارے سلفِ صالحین اور ائمۂ مقدسین کے مسلک کو جھوٹا کہتا ہے۔ عوام پر عقل و فکر کے دروازے پہلے ہی بند ہوتے ہیں۔ جب ان کے جذبات کو بھڑکا دیا جائے تو ان کے آتش فشاں کا لاوا اُبل پڑتا ہے ——— دنیا میں سب سے زیادہ خطرناک حادثہ وہ ہوتا ہے جب جہالت، میدانِ عمل میں اُتر آئے!

مذہب، اس قسم کے وقتی ہنگامے تو برپا کرا سکتا ہے، دوام اس کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ مذہب پرست قومیں اہلِ فکر و عمل قوموں سے کوسوں پیچھے ہوتی ہیں۔ وہ قومیں، ہر آن آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ لیکن مذہب پرست قوم اپنے مقام پر کھڑی، جمود کی حرکت میں مصروف رہتی ہے اور اس سعیٔ لاحاصل سے تھک کر، مرورِ زمانہ [illegible] غبارِ کارواں کی طرح، خاک نشیں ہو جاتی ہے، اور ——— قرآن کے الفاظ میں، نہ آسمان ان کے غم میں روتا ہے، نہ زمین ان کی موت پر آنسو بہاتی ہے۔ (۴۴/۲۹)

(○)

کائنات میں تفکر

پہلے کہا جا چکا ہے کہ قرآن کریم نے تاکید کی ہے کہ "دنیا اور آخرت میں فکر کیا کرو"۔ دنیا سے مراد خارجی کائنات ہے۔ اس کے متعلق اس نے کہا کہ

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (۴۵/۱۳)۔

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں (ارض و سماوات) میں جو کچھ ہے، خدا نے ان سب کو تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیں (حقیقت تک پہنچنے کی بہت بڑی نشانیاں ہیں)۔

کائنات میں قوانینِ فطرت کارفرما ہیں، جو اٹل اور غیر متبدل ہیں۔ یہ قوانین انسانی فکر کے وضع کردہ نہیں۔ (خدا کے متعین کردہ ہیں) لیکن انسانی فکر انہیں دریافت کر سکتی ہے۔ اس کے بعد ان قوانین کی رو سے، فطرت کی مخفی قوتوں کو منکشف کیا جا سکتا اور انہیں اپنے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ انسانی فکر جوں جوں آگے بڑھتی جاتی ہے، تسخیرِ فطرت کے نت نئے گوشے نمودار ہوتے چلے جاتے ہیں۔

جب مذہب، انسانی فکر کو ماضی کی کسی منزل میں ساکن اور منجمد کر دیتا ہے، تو فطرت کے متعلق جو کچھ اُس وقت تک معلوم ہو چکا ہوتا ہے (یا جو نظریات اُس وقت قائم ہوتے ہیں) ان کا علم اس سے آگے نہیں بڑھتا۔ اگر کوئی مفکر یا سائنسدان، تازہ فکر کی رو سے کوئی نیا انکشاف کرتا ہے، تو مذہب یہ کہہ کر اس کے خلاف موت کا فتویٰ صادر کر دیتا ہے کہ یہ نظریہ اسلاف کے مسلک کے خلاف، لہٰذا الحاد اور بے دینی ہے۔ یورپ (عیسائیت) کی سولھویں، سترھویں صدی سے پیشتر کی تاریخ اس "معرکۂ مذہب اور سائنس" کی تاریخ ہے۔ اس میں، گلیلیو یا کوپرنیکس، جیسے سائنس دانوں کو اس جرم کی پاداش میں مستحقِ دار و رسن قرار دیا گیا تھا کہ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ زمین گول ہے یا گردش کرتی ہے۔ اقوامِ مغرب نے تنگ آ کر، آخر مذہب کا لبادہ اتار کر پھینکا تو آج چاند تک کو اپنے زیرِ قدم لانے کے تابل ہو گئیں۔ ان کا پادری تو آج بھی یہ کہتا

ہے کہ کائنات، فلاں سن، فلاں مہینے اور فلاں دن کو وجود میں آئی تھی، لیکن اس کی اس آواز کو گرجے کی چاردیواری سے باہر، درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔

لیکن چونکہ وہ قومیں "آخرت کی زندگی" (خدا کے قانونِ مکافات یا اقدارِ خداوندی) کی قائل نہیں

اقدارِ حیات

اس لئے وہ جوں جوں، فطرت کی قوتوں کی تسخیر میں آگے بڑھتی جاتی ہیں، باہمی تصادمات سے، انسانی دنیا کو جہنم زار بنائے چلی جا رہی ہیں جس میں خود بھی جلتی ہیں اور باقی انسانیت کو بھی جلاتی ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار — عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا!
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

(یہاں عشق اور فرمانِ نظر سے مراد، اقدارِ حیات، قرآن کی صداقت پر یقین ہے۔)

(۲)

قرآن نے "دنیا اور آخرت" دونوں کو فکر کی جولانگاہ قرار دیا ہے۔ "دنیاوی فکر" سے مراد وہ تمام علومِ سائنس ہیں جن کی تحصیل کے لئے اقوامِ مغرب کی (مذہب کی گرفت سے آزاد شدہ) فکر اس قدر مصروفِ سعی و کاوش ہے۔ قرآنِ کریم نے (چھٹی صدی عیسوی میں) ان علوم کی تحصیل کو مومن کی زندگی کا شعار بنایا تھا۔ اس کی تائید میں بکثرت آیات پیش کی جا سکتی ہیں (اور میں، اس سے پہلے، متعدد بار انہیں پیش کر چکا ہوں) لیکن یہاں صرف ایک آیت پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ سورۂ فاطر میں ہے: أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا ط...... (۳۵/۲۷)۔ کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ بارش کا نظام کیا ہے اور انواع و اقسام کی فصلوں، پھولوں اور پھلوں کی پیدائش و افزائش کو کیسے قوانینِ فطرت کی رو سے ظہور پذیر ہوتی ہے؟ —— آپ غور کیجئے کہ ان دونوں شعبوں کے تحت کس قدر علومِ سائنس آجاتے ہیں؟

اس کے بعد ہے: وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ (۳۵/۲۷)۔ اور کبھی تم نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ پہاڑ، جو نظر بظاہر، چٹانوں کے بے ہنگم انبار دکھائی دیتے ہیں، ان کے مختلف رنگوں کے قطعات —— کوئی سفید، کوئی سرخ، کوئی کالا بھجنگ —— کس قسم کے ارتقائی نظام کی شہادت دیتے ہیں —— آپ دیکھیے کہ اس میں کتنے علومِ سائنس شامل ہو جاتے ہیں؟

ازاں بعد فرمایا: وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَٰلِكَ ط... (۳۵/۲۸) اسی طرح انسانوں، دیگر حیوانوں اور مویشیوں پر نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ ان کی کس قدر اقسام ہیں اور ہر قسم (نوع) کس طرح منفرد خصوصیات کی حامل ہے —— اس کے تحت سائنس کی کس قدر متعدد شاخیں آجاتی ہیں۔

ان تصریحات کے بعد کہا: اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ ٥ (۳۵/۲۸) صحیفہ فطرت کے یہ اوراق، یوں تو سب کے سامنے کھلے رہتے ہیں، لیکن ان قوانین کی عظمت کے سامنے وہی لوگ جھکتے ہیں جو ان پر علم و بصیرت کی رُو سے غور و فکر کرتے ہیں۔ یہی لوگ "علماء" کہلانے کے مستحق ہیں۔

آپ سوچئے کہ ان آیات میں، علماء کا ترجمہ سائنٹسٹ (SCIENTISTS) کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے؟ دین میں عالم، سائنسدان ہی کو کہتے تھے۔

لیکن جب دین (اسلام) مذہب میں بدل گیا تو فکر کے دروازے بند کر دیئے گئے، اور علوم سائنس کو کفر اور الحاد قرار دے دیا گیا۔ کائنات کے متعلق جو تصورات، اس زمانے میں عام تھے جب فکر کو منجمد کیا گیا، وہ حرفِ آخر قرار پا گئے اور ان کے خلاف سوچنے یا کچھ کہنے کو ارتداد ٹھہرا دیا گیا ——— (مثلاً مذہب کا ارشاد ہے کہ) سب سے پہلا انسان مٹی کا ایک پتلا تھا جس کی پسلی چیر کر اس میں سے ایک عورت نکالی گئی اور ان دونوں کے اختلاط سے نسلِ انسانی کا سلسلہ آگے بڑھا۔ اس پہلے انسان (حضرت آدمؑ) کا قد ساٹھ گز کا تھا۔ آسمان شیشے کا ڈلا ہے جس میں (ستارے) جواہرات کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ سورج، شام کو خدا کے عرش کے نیچے چھپ جاتا ہے جہاں سے فرشتے اسے دوسری صبح نکالتے ہیں۔ دوزخ کا منہ باندھا ہوا ہے اور اُسے سال میں صرف دو سانس لینے کی اجازت ہے۔ جب وہ سانس باہر کی طرف لیتا ہے تو گرمی کا موسم آجاتا ہے، جب اندر کھینچتا ہے تو سردی کا موسم آجاتا ہے۔ زمین چپٹی ہے اور ساکن۔ بنی اسرائیل کے جو اسباط (قبائل) گم ہو گئے تھے، وہ چوہوں کی شکل میں پیدا ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ (یہ بخاری کی احادیث ہیں) اگر کوئی شخص ان سے انکار کرے تو اسے دائرۂ اسلام سے خارج قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس فکری جمود کا نتیجہ ہے کہ اقوامِ عالم کہیں کی کہیں پہنچ چکی ہیں، اور ہم زندگی کے ہر شعبہ میں ان کے دست نگر ہیں۔ اتنا ہی نہیں کہ ہم خود علومِ سائنس کی تحصیل نہیں کرتے۔ سائنس کی رُو سے جو نئی ایجاد دُنیا کے سامنے آتی ہے، مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس سے مستفید ہونے کو بھی ناجائز قرار دے دیا جاتا ہے ——— ریڈیو کا استعمال ناجائز ہے۔ ٹیلی ویژن دیکھنا بھی گناہ ہے کیونکہ اس میں چلتی پھرتی انسانی تصویریں سامنے آتی ہیں۔ ٹیلی فون میں شیطان بولتا ہے۔ مردہ کی آنکھوں کو اندھوں کی پیشانی میں پیوند کرنا ناجائز ہے۔ اسی طرح دیگر اعضا کی پیوند سازی (تقلیم) بھی ناجائز ہے۔ جب مغربی خلا نورد چاند پر پہنچے ہیں، تو ہمارے مذہبی حلقوں کی طرف سے آوازیں بلند ہوئی تھیں کہ یہ دعویٰ بالکل باطل ہے۔ چاند ایسا تھی نہیں کہ اس پر کسی انسان کا پاؤں ٹک سکے۔ حضورؐ نے اپنی انگلی کے اشارے سے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے، ایک ٹکڑا آپؐ کی دائیں بغل کے نیچے سے نکل گیا تھا۔ دوسرا ٹکڑا بائیں بغل کے نیچے سے۔ وقس علیٰ ھذا۔ ان "نظریات" کو پیش کرنے والے ہمارے ہاں "علماء" کہلاتے ہیں۔ آپ غور فرمایئے کہ دین کے علماء اور مذہب کے علماء میں کس قدر تفاوت ہے؟

فکرِ آخرت

اب آئیے "فکرِ آخرت" کی طرف۔ کارگہِ کائنات میں فکری جمود کا نتیجہ تو متاعِ فطرت سے محرومی اور حرماں نصیبی ہے۔ اُخروی زندگی سے متعلق امور میں فکر (سوچ) کے شجرِ ممنوعہ قرار پا جانے سے ہم نہ دین کے رہے نہ دنیا کے۔ اُخروی زندگی میں غور و فکر کے لئے قرآن کریم نے ایک ایسے نظامِ معاشرہ کے قیام کو ضروری قرار دیا تھا جس کی عمارت اقدار و اصولِ خداوندی پر استوار ہوتی ہے۔ ان اقدار و اصول کی کیفیت یہ ہے کہ

(۱) قوانینِ فطرت کی طرح، یہ اقدار و اصول بھی فکرِ انسانی کی تخلیق نہیں۔ خدا کے متعین فرمودہ ہیں۔

(۲) یہ بھی قوانینِ فطرت کی طرح، غیر متبدل اور ابدی ہیں۔

(۳) قوانینِ فطرت کو انسانی فکر دریافت کر سکتی ہے لیکن یہ اقدار و اصول وحی کے ذریعے بوساطت انبیاء کرامؑ انسانوں کو دیئے جاتے تھے۔ اب یہ اپنی آخری، مکمل اور غیر متبدل شکل میں، قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ انسانی غور و فکر ان کی صداقت کا ثبوت فراہم کر دیتے ہیں۔

(۴) قوانینِ فطرت اور اقدارِ وحی کی کارفرمائی کا انداز یکساں ہے۔ قوانینِ فطرت، محکم اصولوں کی طرح اپنے مقام پر اٹل رہتے ہیں، اور انسانی فکر ان کی روشنی میں نت نئے نظریات وضع کرتی۔ نئے نئے انکشافات کرتی اور انواع و اقسام کی ایجادات ظہور میں لاتی رہتی ہے۔ اسی طرح، وحیٔ خداوندی کی رُو سے جو نظامِ معاشرہ قائم ہوتا ہے، اس میں یہ اقدار، غیر متبدل حدود کا کام دیتی ہیں۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، یہ نظام، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، عملی جزئیات مرتب کرتا ہے جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان اقدار پر عمل کس طرح کیا جائے۔ جوں جوں زمانے کے تقاضوں میں تبدیلیاں رونما ہوں گی اور انسانی فکر آگے بڑھتی جائے گی، ان عملی جزئیات میں تبدیلیاں ہوتی جائیں گی، البتہ اقدار کی رُو سے متعین شدہ حدود اپنی جگہ محکم رہیں گی۔ ان عملی جزئیات کو اصطلاح میں، احکامِ شریعت کہا جاتا ہے اور جس فکری طریق سے ان میں حک و اضافہ، اور ترمیم و اصلاح کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اسے اجتہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے ——— اجتہاد کے معنی ہیں فکری جدّ و جہد ——— وہی فکر جس کی اس قدر تاکید کی گئی ہے۔

فکر منجمد ہو گئی

جب اسلام، دین کی شکل میں قائم تھا تو اس میں اسلامی نظام کا یہی نقشہ تھا۔ یعنی خدا کی مقرر کردہ اقدار (حدود) کے اندر رہتے ہوئے فکر کی کارفرمائی۔ اس کے بعد جب اسلام، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو اس کی رُو سے:-

(۱) انسانی فکر اُس زمانے کی سطح پر پہنچ کر جامد ہو گئی جس زمانے میں دین، مذہب میں تبدیل ہوا تھا اور

(۲) اس کے ساتھ ہی اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا اور انسانی فکر نے جو احکامِ شریعت اس زمانے میں وضع کئے تھے، انہیں ابدی اور غیر متبدل قرار دے دیا گیا۔ انہیں فقہی احکام کہا جاتا ہے۔ یہ تبدیلی، بہ حیثیتِ مجموعی، عباسیوں کے دورِ ملوکیت میں رونما ہوئی تھی۔ ان احکام پر ملوکیت کی چھاپ کا لگنا ناگزیر تھا۔

اس وقت سے لے کر اب تک یہ قوم، دنیاوی (کائناتی) اور اُخروی (اقدارِ خداوندی) دونوں امور سے متعلق، اُسی مقام پر کھڑی ہے جہاں اِس کی فکر مفلوج اور جامد ہوئی تھی۔ اب اسلامی اور غیر اسلامی کا معیار یہ ہے کہ جو معتقدات اور نظریات، یا احکام و شعائر، ان معتقدات و احکام کے مطابق ہوں جو اُس

زمانے میں رائج تھے، انہیں اسلامی قرار دیا جاتا ہے۔ جو ان سے مختلف ہوں، انہیں غیر اسلامی۔ یعنی اب اسلام، اقدار و اصولِ خداوندی کی حدود کے اندر زندگی بسر کرنے کا نام نہیں۔ ان عقائد کا معتقد اور اُن احکام کا پیرو ہونے کا نام ہے جو ملوکیتِ عباسیہ کے زمانے میں وضع ہوئے یا رائج تھے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، اسے فقہی مسلک کہا جاتا ہے۔ اس ضمن میں اس نکتہ پر غور کیجئے کہ فقہ (تفقہ) کے معنی غور و فکر کرنا ہیں۔ لیکن اب فقہی احکام انہیں کہا جاتا ہے جن میں غور و فکر حرام ہے۔

(۰)

شخصیت پرستی

فقہ کے احکام، انسانوں کے مرتب کردہ تھے۔ وہ حضرات (فقہا) کتنے ہی بلند مرتبہ بزرگ اور ماہرینِ قوانین کیوں نہ ہوں، لیکن تھے تو بالآخر انسان ہی۔ اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے قوانین (کلمات اللہ) کو غیر متبدل قرار دیا ہے۔ (۶/۱۱۶)۔ لہٰذا، انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو غیر متبدل قرار دینا، انہیں خدائی درجہ دے دینا ہے جو بالبداہت شرک ہے۔ قرآن کی بنیادی حقیقت یہ بھی ہے کہ اس نے شخصیتوں کو ختم کر کے، صرف خدا کی حاکمیت کو باقی رکھا۔ دیکھئے، وہ کس قدر دلکشا الفاظ میں اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے جب کہتا ہے کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ (۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ...... خواہ اسے مقننہ کے اختیارات حاصل ہوں اور خواہ انتظامیہ کے۔ حتیٰ کہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہو۔ کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہیئے کہ تم اس کتاب کی محکومیت اختیار کر کے جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو، اور جس پر تم غور و خوض کرتے ہو، اللہ والے بن جاؤ۔

انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو ابدی (غیر متغیر) قرار دینے میں عملی نقص یہ ہے کہ ہزار سال پہلے کے زمانے کے حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے وضع کردہ قوانین، اُس زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوں تو کرتے ہوں، ہزار سال بعد کے زمانے کے تقاضوں کو کبھی پورا نہیں کر سکتے۔ وہ اس قدر بدلے ہوئے ماحول میں فٹ ہی نہیں بیٹھ سکتے۔ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کا تجربہ تو ہم نت نئے دن کرتے رہتے ہیں۔ مسودۂ قانون بڑے غور و فکر کے بعد مرتب ہوتا ہے۔ پارلیمان میں سینکڑوں اراکین کے اجلاس میں وہ معرضِ بحث بنتا ہے۔ دو دو تین تین دفعہ اُسے دہرایا جاتا ہے۔ اس میں کئی ترامیم کی جاتی ہیں حکومت میں ماہرینِ قانون کا ایک خاص شعبہ اس کے ایک ایک لفظ کی چھان بین کرتا ہے۔ اتنی چھلنیوں میں سے چھننے کے بعد، وہ آخری شکل اختیار کرتا ہے۔ لیکن ہنوز وہ پریس میں ہوتا ہے کہ اس کی ترمیم شائع کرنی پڑ جاتی ہے۔ یہ ہے انسانی قانون سازی کی کیفیت۔ ہزار سال پہلے تو قانون سازی کے سلسلہ میں اس قدر اہتمامات کا تصور تک نہیں تھا۔ لہٰذا، اس زمانے کے انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو ابدی طور

پر غیر متبدل قرار دے دینا، عقیدت مندانہ جذبات کی تسکین تو کر سکتا ہے۔ عملی زندگی میں ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔

ابتداءً فقہی قوانین سے اختلاف، قابلِ اعتراض نہیں تھا۔ علامہ اقبالؒ کی تحقیق کی رُو سے، چوتھی صدی ہجری کے آغاز تک، قریب انیس مختلف مراکزِ فقہ وجود میں آچکے تھے[۱]۔ ان میں سے متعدد (حنفی۔ شافعی۔ مالکی۔ حنبلی وغیرہ) اب بھی باقی ہیں۔ لیکن بعد میں جب، اسلاف کے مسلک کو دین بنا دیا گیا اور فکر پر پہرے بٹھا دیئے گئے، تو ہر فرقہ نے اپنی فقہ کو محفوظ اور مستحکم رکھنے کے لئے، اسے مقدس بنا دیا اور اس سے ذرا سے اختلاف کو خلافِ اسلام قرار دے دیا۔

آپ شاید دل میں سوچتے ہوں کہ جب اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کرتا کہ ان قوانین کے واضعین بہرحال انسان تھے، تو ان کے وضع کردہ قوانین کو یہ حیثیت دی کیسے گئی؟ یہ نقطہ واقعی اہم ہے اور گہرے غور و فکر کا محتاج! انہیں یہ حیثیت اس طرح حاصل ہو گئی کہ ان کے متعلق کہا گیا کہ یہ قوانین اُن فقہا کے خود وضع کردہ نہیں بلکہ نبی اکرمؐ کے ارشادات (احادیث) پر مبنی ہیں۔ لہٰذا ان قوانین سے اختلاف یا ان کا انکار، احادیث یا سنتِ رسول اللہؐ سے انکار کے مرادف ہے۔ اور یہ کفر ہے۔ ان قوانین کی حضورؐ کی طرف نسبت سے، اب سوال فکر سے متعلق نہ رہا، جذبات سے وابستہ ہو گیا۔ اور جو سوال جذبات سے وابستہ ہو جائے، اس کی تقدیس، تنقید کی حد سے ماورا ہو جاتی ہے۔ یہ مقام بڑا نازک ہوتا ہے۔ عزت بخاری کے الفاظ ہیں: ؎

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر — نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

منکرِ حدیث

نتیجہ اس کا یہ کہ جو نہی کسی نے کسی فقہی فیصلہ سے اختلاف کیا، یا اس پر اعتراض کیا، اس کے متعلق مشہور کر دیا کہ وہ منکرِ حدیث ہے۔ منکرِ سنتِ رسول اللہؐ ہے۔ اس سے عوام کے جذبات جس قدر مشتعل ہو سکتے ہیں، ظاہر ہے۔ یہ ہے وہ ٹیکنیک جس سے فقہی عقائد و احکام کو تنقید کی حد سے بالا تسلیم کرایا جاتا ہے۔

یہ واقعی بڑا نازک مقام ہے۔ لیکن میں کوشش کروں گا کہ ان حضرات کے جذبات کی نزاکت کو بھی ملحوظ رکھتے ہوئے، یہ واضح کروں کہ انکارِ حدیث یا انکارِ سنت کی حقیقت کیا ہے، اور جسے حدیث یا سنتِ رسول اللہؐ سے انکار کہا جاتا (یا مشہور کیا جاتا) ہے وہ درحقیقت کس چیز کا انکار ہوتا ہے۔ اس مقام پر میرا مخاطب وہ طبقہ ہے جو سوچ سے کام لینا چاہے۔ نہ کہ وہ جو جذبات میں بہہ جانا چاہے۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَظِیْمِ۔

(۱)

---

[۱] یہ اُس زمانے کی بات ہے جب اُمت کی مرکزیت (خلافت علیٰ منہاج رسالت) ختم ہو چکی تھی۔ مرکزیت کے زمانے میں انفرادی فقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا، جیسے آج بھی کسی باضابطہ حکومت کی موجودگی میں انفرادی قانون سازی کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔

میں بحث سے پہلے اپنے اس ایمان کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ

میرا ایمان | جو شخص رسول اللہؐ کے کسی ارشاد یا حضورؐ کے کسی عمل کی صداقت سے انکار کرتا ہے، میرے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا۔

اس سلسلہ کہ حضورؐ کے ارشادات و اعمالِ حسنہ سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے "اسوۂ حسنہ" قرار دیا ہے۔ اس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ معترضین جسے انکارِ حدیث یا انکارِ سنّت کہہ کر، کفر قرار دیتے ہیں، وہ (درحقیقت) انکار ہوتا کس بات سے ہے؟ اس کے لئے یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ حدیث یا سنّت کی صحیح پوزیشن کیا ہے!

اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ

(۱) حضور نبی اکرمؐ نے اپنے ارشادات کا کوئی مجموعہ مرتّب کر کے اُمّت کو نہیں دیا۔ نہ ہی کسی کے مرتّب کردہ مجموعہ پہ مہرِ تصدیق ثبت فرمائی۔ حضورؐ نے اُمّت کو صرف خدا کی کتاب (قرآن مجید) دی۔

(۲) نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے ان ارشادات (احادیث) کا کوئی مجموعہ مرتّب کیا۔

(۳) حضور نبی اکرمؐ کی وفات کے قریب دو سو سال بعد، بعض حضرات نے اپنے طور پر کوشش کی کہ جن باتوں کو لوگ، حضورؐ کے ارشادات کہہ کر بیان کرتے تھے، انہیں اکٹھا کیا جائے۔ اس میں سرِفہرست وہ چھ حضرات ہیں جن کے مجموعوں کو سُنّی حضرات "صحاح ستہ" کہہ کر پکارتے ہیں۔ (شیعہ حضرات کے مجموعے الگ ہیں)۔ (ضمناً) یہ سب جامعینِ احادیث ایرانی تھے۔ ان میں عرب کوئی نہیں تھا۔ میں ان میں سے، صرف ایک بزرگ، امام بخاریؒ (متوفی ۲۵۶ھ) کے نام سے متعیّن گفتگو کروں گا۔ لیکن جو کچھ ان کے متعلق کہا جائے گا، اس کا اطلاق باقی جامعینِ احادیث پر از خود ہو جائے گا۔

امام بخاریؒ نے لکھا ہے کہ انہوں نے جو روایات لوگوں کی زبانی سُن کر اکٹھی کیں ان کی تعداد چھ لاکھ تک پہنچتی ہے[1]۔ ظاہر ہے کہ جنہوں نے یہ روایات امام بخاریؒ سے بیان کیں وہ امام صاحبؒ کے زمانے میں موجود تھے۔ لیکن ان کے اور رسول اللہؐ کے زمانے میں قریب دو سو سال کا بُعد (فاصلہ) تھا۔ اس لئے ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے یہ بات خود رسول اللہؐ سے سُنی تھی۔ وہ کیا کہتے تھے؟ وہ یہ کہتے تھے کہ میں نے یہ بات فلاں سے سُنی تھی اور اس نے فلاں سے

---

[1] امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ صحیح حدیثوں کی تعداد سات لاکھ سے اوپر ہے۔ امام یحییٰ بن معینؒ بارہ لاکھ حدیثوں کے مالک تھے۔

اور اس طرح متعدد راویوں کا سلسلہ صحابہ کرامؓ یا رسول اللہؐ تک پہنچا دیا جاتا تھا۔

اگر کسی عدالت میں، ایک گواہ یہ کہے کہ میں نے اس واقعہ کو خود نہیں دیکھا، میں نے یہ بات فلاں سے سُنی ہے، تو عدالت اس کی گواہی قبول نہیں کرتی۔ آپ سوچیئے کہ جب، ایک گواہ کی سُنی سنائی بات کو شہادت تسلیم نہیں کیا جاتا، تو دو سو سال پر پھیلے ہوئے عرصہ کے پانچ سات راویوں کی سُنی سنائی باتوں کو شہادت کیسے کہا جا سکے گا؟

پھر، یہ بھی نہیں تھا کہ سب سے پہلے راوی نے رسول اللہؐ کے الفاظ اگلے راوی تک منتقل کر دیئے ہوں۔ اس نے حضورؐ کے ارشاد کا جو مطلب سمجھا اسے آگے منتقل کیا۔ اس طرح ہر راوی نے، سابقہ راوی کے بیان کا جو مطلب سمجھا، اسے آگے بیان کر دیا، اس طرح یہ مطلب در مطلب مختلف راویوں کی زبانی، امام بخاریؒ تک پہنچا۔

آپ کسی محفل میں بیٹھے ہوئے دس احباب میں سے اپنے قریب ترین دوست کے کان میں کوئی بات کہیئے۔ وہ اسے اپنے الفاظ میں اگلے دوست تک پہنچائے۔ وہ اگلے تک۔ اس کے بعد وہ بات آپ تک واپس پہنچے تو آپ دیکھئے گا کہ آپ کی بات کیا سے کیا بن کر آپ تک پہنچتی ہے؟ یہ ایک ہی وقت میں ایک ہی نشست میں مطلب کے تفاوت کی مثال ہے۔ آپ سوچیئے کہ جب کسی بات کا مطلب راویوں کے اپنے الفاظ میں، دو سو سال کے عرصہ میں، جامع روایات تک پہنچے تو اس کی اصل سے کیا نسبت رہ جائے گی۔

اس طرح چھ لاکھ احادیث، امام بخاریؒ تک پہنچیں۔ انہوں نے ان میں سے، قریب سات ہزار کو قابل قبول سمجھا اور باقی حدیثوں کو مسترد کر دیا۔ ان میں سے اگر مکرّرات کو نکال دیا جائے تو باقی قریب تین ہزار روایات رہ جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ امام بخاریؒ کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا جس سے وہ خود ذاتِ رسالتمآبؐ سے تصدیق کر لیتے کہ فلاں روایت فی الحقیقت آپ کی ہے! امام بخاریؒ نے اپنے خیال یا اپنی رائے میں جن روایات کو قابلِ قبول سمجھا، انہیں اپنے مجموعہ میں شامل کر لیا۔ جنہیں اپنے خیال میں صحیح نہ سمجھا انہیں مسترد کر دیا۔ ایسے معاملات میں انسان کے خیال یا رائے یا عقیدے کا کس قدر گہرا اثر ہوتا ہے، اس کا اندازہ اس ایک مثال سے لگایئے کہ امام بخاریؒ کو اس مسئلہ میں کہ ایمان گھٹتا بڑھتا ہے یا نہیں، امام اعظمؒ (امام ابوحنیفہؒ) سے اختلاف تھا۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ امام اعظمؒ کو ثقہ قرار نہیں دیتے۔ پھر یہیں تک بس نہیں۔ چونکہ امام اعظمؒ کوفہ کے رہنے والے تھے اس لئے امام بخاریؒ کے نزدیک، تمام اہلِ کوفہ غیر معتبر قرار پا گئے۔ چونکہ کوفہ عراق میں ہے اسلئے عراق والے بھی اسی زمرہ میں شمار ہو گئے اور انہوں نے فیصلہ کر دیا کہ عراق والوں کی سو حدیثوں میں ننانوے چھوڑ دو۔ جو ایک لو اسے بھی مشتبہ سمجھو۔ اسی طرح ایک فرعی عقیدہ کے اختلاف کی بنا پر، دو جلیل القدر ائمہ، یعنی امام ابوزرعہؒ اور امام ابوحاتمؒ نے خود امام بخاریؒ کی ثقاہت پر اعتراض کیا ہے۔ بخاریؒ اور مسلمؒ کے مجموعوں کو صحیحین کہا جاتا ہے۔ ان کی آپس میں یہ کیفیت ہے کہ امام مسلمؒ، امام بخاریؒ کی ثقاہت پر طعن کرتے ہیں۔

اس کے بعد جامع حدیث کے ذاتی مسلک کی طرف آیئے۔

روایات کا انتخاب

جناب عبدالقدیر صارم کا ایک مقالہ، سیرتِ امام بخاریؒ کے عنوان سے، دہلی سے شائع ہونے والے ماہنامہ "آستانہ" کی جون ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں چھپا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ

(۱) امام صاحبؒ کو جو مال ان کے والد سے ترکہ میں ملا، وہ اسے مضاربہ کے طور پر دوسروں کو دے دیا کرتے تھے۔ جو منافع ہوتا اس سے بسر اوقات کرتے اور اپنا سارا وقت تحصیل حدیث میں صرف کیا کرتے تھے۔ (صفحہ ۴۲)

مضاربہ کے معنی ہیں (SLEEPING PARTNERSHIP) یعنی سرمایہ لگا کر اس کا منافع لینا۔

(۲) امام صاحبؒ کو غلاموں کی تجارت میں پانچ سو درہم ماہانہ کی آمدنی ہوتی تھی۔ (صفحہ ۴۲)

ظاہر ہے کہ جب امام صاحبؒ نے حدیثوں کا انتخاب کیا تو ان حدیثوں کو صحیح قرار دیا جن میں مضاربت اور غلاموں کی تجارت کو جائز کہا گیا ہو۔ اور ان دو ایک عقائد پر ہی کیا موقوف۔ ہے، ظاہر ہے کہ انہوں نے انہی روایات کو قابلِ قبول قرار دیا جو ان کے عقائد اور مسلک کے مطابق تھیں۔

سو پہلی بات یہ ہے کہ امام بخاریؒ (اور اسی طرح ہر جامعِ احادیث) نے انہی روایات کو صحیح قرار دیا جو ان کی رائے میں قابلِ قبول تھیں۔

(۰)

اربابِ جرح و تعدیل

اس کے بعد کچھ اربابِ فن نے یہ سوچا کہ اس امر کی تحقیق کی جائے کہ جن راویوں نے یہ روایات بیان کی ہیں، وہ قابلِ اعتماد (ثقہ) بھی تھے یا نہیں! یہ خیال تو اچھا تھا لیکن آپ سوچئے کہ ان کے پاس وہ کونسے ذرائع تھے جن کی بنا پر وہ ڈیڑھ، دو سو سال پہلے کے انسانوں کے متعلق یقینی طور پر معلوم کر سکتے کہ وہ کیسے تھے؟ ظاہر ہے کہ اس تحقیق میں انہیں جو (MATERIAL) بھی میسر آیا، وہ اسی کی بنا پر ان راویوں کی ثقاہت یا عدمِ ثقاہت کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکتے تھے؛ یہاں معیار پھر ان کی "رائے" قرار پا گئی۔ اس باب میں سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) کہتے ہیں:-

جن حضرات نے رجال کی جرح و تعدیل کی ہے وہ بھی تو آخر انسان تھے۔ بشری کمزوریاں ان کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ کیا ضرور ہے کہ جس کو انہوں نے ثقہ قرار دیا ہو، وہ بالیقین ثقہ اور تمام روایتوں میں ثقہ ہو۔ اور جس کو انہوں نے غیر ثقہ ٹھہرایا ہو وہ بالیقین غیر ثقہ ہو اور اس کی تمام روایتیں پایۂ اعتبار سے ساقط ہوں۔ پھر ایک ایک راوی کے حافظہ اور نیک نیتی اور صحتِ ضبط وغیرہ کا حال بالکل صحیح معلوم کرنا تو مشکل ہے۔

(تفہیمات۔ حصہ اول۔ صفحہ ۳۴۲)

اسماء الرجال

اس کے بعد، بعض اربابِ فن نے اس امر کی تحقیق کی کوشش کی کہ راوی جس شخص سے روایت لیتا ہے، آیا وہ اس کا ہم عصر بھی تھا یا نہیں۔ ہم عصر تھا تو وہ

اس سے ملا بھی تھا یا نہیں۔ ملا تھا تو کیا اس نے یہ خاص حدیث اُس سے سُنی تھی یا کسی اور سے سن لی تھی۔ ان کی تحقیق کے متعلق بھی مودودی مرحوم نے کہا ہے کہ:

> اسے کلیتہً صحیح نہیں سمجھا جاسکتا۔ یہ مواد اس حد تک قابلِ اعتماد ضرور ہے کہ سنتِ نبویؐ اور آثارِ صحابہؓ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے۔ مگر اس قابل نہیں ہے کہ بالکل اسی پر اعتماد کر لیا جائے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۲۲)

ارباب جرح و تعدیل اور اسماء الرّجال نے، راویوں کی ثقاہت، کے متعلق جو رائے قائم کی، اس کی رُو سے انہوں نے احادیث کے مختلف درجے مقرر کر دیئے۔ کسی کو صحیح کہا۔ کسی کو حسن، کسی کو ضعیف وغیرہ۔ ان میں "صحیح" کی اصطلاح بڑی مغالطہ آفریں ہے۔ سُنیوں کی احادیث کے چھ مجموعوں کو صحاح ستہ کہا جاتا ہے۔ یعنی صحیح حدیثوں کے چھ مجموعے۔ بخاریؒ اور مسلمؒ کو صحیحین۔ اور بخاریؒ کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ۔ ان کی حدیثوں کو صحیح کہنے سے عام طور پر، ذہن میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ یہ یقینی طور پر صحیح، یعنی رسول اللہؐ کے مستند ارشادات ہیں۔ لیکن درحقیقت بات یہ نہیں۔ یہ صرف محدثین کی اصطلاح کے طور پر صحیح کہلاتی ہیں۔ یقینی طور پر ان کے متعلق بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اقوالِ رسول اللہؐ ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ آپ کو ہر حدیث کے آخر میں یہ لکھا ملے گا ——— "او کما قال رسول اللہؐ" ——— یوں، یا جیسے رسول اللہؐ نے فرمایا ہو!

———(٠)———

حدیث کا مقام

ان تصریحات کی روشنی میں یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ جس طریق سے یہ احادیث جمع اور مرتب ہوئی ہیں اس کی رُو سے، کسی ایک حدیث کے متعلق بھی حتمی اور یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ارشادِ رسول اللہؐ ہے۔ اس کے متعلق یہی کہا جا سکے گا کہ وہ نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کردہ قول ہے۔ مودودی مرحوم کے الفاظ ہیں:-

> اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہؐ کی طرف منسوب ہو، اس کی نسبت کا صحیح اور معتبر ہونا، بجائے خود زیرِ بحث ہوتا ہے۔ آپ (یعنی منکرین حدیث) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسول ماننا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ (رسائل و مسائل۔ حصہ اوّل۔ ۱۹۵۱ء ایڈیشن۔ صفحہ ۲۹)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

> قولِ رسول اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں، لازماً ایک ہی چیز نہیں ہیں۔ اور نہ ان روایات کو استناد کے لحاظ سے آیاتِ قرآنی کا ہم پلّہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ آیاتِ قرآنی کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش نہیں۔ بخلاف اس کے، روایات میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو نبی (صلعم) کی طرف منسوب کیا گیا ہے،

وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں۔ (ایضاً صفحہ ۲۷)

(ضمناً) میں بھی یہی کہتا ہوں جو مودودی (مرحوم) کہتے ہیں۔ لیکن یہ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ مودودی مرحوم کو منکرِ حدیث نہیں کہا جاتا اور میرے منکرِ حدیث ہونے کا ڈھنڈورا اس زور سے پیٹا جاتا ہے کہ اس کی آواز دور دراز گوشوں تک پہنچتی ہے۔ اور ان ڈھنڈورا پیٹنے والوں میں خود مودودی (مرحوم) اور ان کی جماعت بھی شامل ہوتی ہے!

بہرحال یہ ہے احادیث کی صحیح پوزیشن۔ لیکن ان کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ

دوسری طرف

تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآنِ عزیز کا ہے۔ اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان اور دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآنِ عزیز کے انکار کا ...... جو احادیث قواعدِ صحیحہ اور ائمہ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ہوں ...... ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مرادف ...... بخاری اور مسلم کی احادیث کی صحت پر امت متفق ہے ...... ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔

(جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث۔ از مولانا محمد اسماعیل (مرحوم) سابق صدر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث۔ صفحہ ۴۵ ؛ ۵۵)

یعنی بخاری یا مسلم کی کسی ایک حدیث کے انکار سے بھی ایک مسلمان کافر ہو جاتا ہے اور ملت کے دائرہ سے خارج قرار پاتا ہے۔ (مثلاً) بخاری کی حدیث ہے کہ "جب ملک الموت، حضرت موسیٰؑ کی جان قبض کرنے کے لئے آیا تو انہوں نے اسے ایسا تھپڑ مارا کہ وہ لوٹ کر خدا کے پاس چلا گیا"۔ (کتاب الانبیاء) اگر آپ اس حدیث کے صحیح ہونے سے انکار کر دیں، تو (مذکورہ بالا فیصلہ کی رو سے) آپ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائیں گے۔

---(o)---

انکارِ حدیث کے معنی!

اس کے بعد ہمیں اس نقطہ کی طرف آجانا چاہیئے کہ انکارِ حدیث کے معنی کیا ہیں؛ یعنی جو شخص کسی حدیث کے صحیح ہونے سے انکار کرتا ہے، وہ کس بات سے انکار کرتا ہے؟

آپ چند صفحات پیچھے چلیے جہاں میں نے کہا ہے کہ امام بخاریؒ نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے ان تین ہزار حدیثوں کو منتخب کر کے اپنے مجموعہ میں شامل کیا جو ان کی رائے میں قابلِ قبول تھیں۔ اب اگر ایک شخص کہتا ہے کہ، میرے نزدیک فلاں حدیث صحیح نہیں، تو وہ رسول اللہؐ کے کسی ارشادِ گرامی کے صحیح ہونے سے انکار نہیں کرتا۔ وہ کہتا صرف یہ ہے کہ میرے نزدیک، امام بخاریؒ کی یہ رائے یا خیال، یا فیصلہ، کہ یہ حدیث قابلِ قبول ہے، صحیح نہیں۔ مجھے ان کی رائے سے اختلاف ہے۔ میں اسے قولِ رسولؐ قرار دینے کے لئے تیار نہیں کیونکہ یہ قرآن کے خلاف ہے۔

لہٰذا، انکارِ حدیث، رسول اللہؐ کے قول سے انکار نہیں۔ امام بخاریؒ کی

رائے سے اختلاف ہے۔
آپ سینے پر ہاتھ رکھ کر دیانتداری سے کہیئے کہ اس میں کونسی بات ایسی ہے جس سے کفر لازم آجائے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کہیں بھی امام بخاریؒ کی اصابتِ رائے پر ایمان لانے کا مکلّف قرار نہیں دیا۱؎۔ یعنی اس نے کہیں یہ نہیں کہا کہ اگر تم یہ مانو گے کہ امام بخاریؒ کی آراء بالکل صحیح اور صائب ہیں، تو تم مسلمان کہلاؤ گے۔ اگر کہو گے کہ مجھے ان کی رائے سے اختلاف ہے تو تم دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاؤ گے۔ ایسا کہنا خالص شخصیت پرستی ہے اور کلیتہً جذبات پر مبنی ہے۔ کسی انسان کی اصابتِ رائے پر ایمان لانا، نہ قرآن کا تقاضا ہے، نہ عقل و فکر کا مطالبہ۔

لیکن قوم ہے کہ جذبات کے ان طوفانوں میں بہے چلی جاتی ہے کہ جونہی کسی نے امام بخاریؒ کی رائے سے اختلاف کیا، اسے کافر اور مرتد قرار دے دیا۔ اور یہ طوفان متلاطم کردہ ہیں مذہبی پیشوائیت کے مسلسل پروپیگنڈہ کے!

اس کے بعد ہم اس نکتہ کی طرف آتے ہیں کہ اس غلط عقیدہ کا قوم کی عملی زندگی پر کیا اثر پڑا ہے، اور پڑ رہا ہے۔ یہ نکتہ بھی گہرے فکر و تدبّر کا محتاج ہے۔

---(٠)---

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ فقہی احکام کس طرح مرتب ہوئے تھے اور انہیں کس طرح ابدی اور غیر متبدل قرار دے دیا گیا۔ یعنی ان کی بنیاد احادیث پر رکھ دی، اور جب احادیث کو ابدی اور غیر متبدل قرار دیدیا گیا تو فقہی قوانین کی حیثیت خود بخود ایسی ہو گئی۔ اس سے نہ صرف یہ کہ فقہی احکام (مودودی مرحوم کے الفاظ میں) "منجمد شاستر" بن کر رہ گئے، بلکہ اس سے اُمّت میں اس قدر تفرقہ پیدا ہو گیا جو کسی صورت میں مٹ ہی نہیں سکتا۔

قرآنِ کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی دی تھی کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ (۴/۸۲) اس کے برعکس احادیث کی یہ حالت ہے کہ مختلف مجموعوں کے باہمی تضادات اور اختلافات تو ایک طرف، اس کے کسی ایک مجموعہ میں باہم گر متضاد احادیث موجود ہوتی ہیں۔

فقہ کے اختلافات

آپ غور فرمایئے کہ جب فقہی احکام کی بنیاد احادیث قرار پا جائے، اور احادیث میں اس قدر اختلاف ہو، تو فقہی احکام میں کس قدر اختلاف ہو گا؟ اُمّت میں اس قدر فرقے اور ان میں باہمی سر پھٹول سب اسی کا نتیجہ ہے۔ احادیث، مختلف فقہی احکام میں سے ہر ایک کو کس طرح سند مہیا کر دیتی ہیں، اس کی ایک مثال، علامہ محمد اسلم جیراجپوریؒ نے اپنی کتاب "ہمارے دینی علوم" (صـ۲۳) میں بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

روایات کا یہ اختلاف دیار و امصار، یعنی حجاز و عراق وغیرہ پر محدود نہیں ہے بلکہ ایک ہی مقام میں

۱؎ نیز اربابِ جرح و تعدیل اور اسماء الرجال کی آراء اور فیصلوں کے صحیح ہونے پر ایمان کا مکلّف!

مختلف اور متضاد روایتیں ہوتی تھیں۔ اس کا ایک نمونہ عبدالوارث بن سعید کا بیان ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "میں مکہ میں آیا تو معلوم ہوا کہ یہاں عراق کے نامور فقہا حج کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ پہلے میں امام ابو حنیفہؒ کے پاس پہنچا اور ان سے پوچھا کہ بیع میں بائع اگر کوئی شرط لگائے تو کیا وہ جائز ہو گی؟ جواب دیا کہ بیع بھی باطل ہے اور شرط بھی۔ پھر میں نے ابن ابی لیلیٰ سے بھی جا کر یہی سوال کیا، انہوں نے کہا کہ بیع جائز ہے اور شرط باطل ہے۔ اس کے بعد ابن شبرمہ سے جا کر دریافت کیا۔ بولے بیع بھی جائز ہے اور شرط بھی جائز ہے۔

میں نے دل میں کہا کہ سبحان اللہ! یہ تینوں فقہا ایک ہی جگہ کے ہیں اور ان میں ایک ہی مسئلہ میں رایوں کا اس قدر اختلاف!

اب دوبارہ میں ابو حنیفہؒ کے پاس گیا اور ان سے یہ سب باتیں کہیں۔ فرمایا معلوم نہیں کہ وہ لوگ کیوں ایسا کہتے ہیں، مجھے تو حدیث ملی ہے:۔

حدثنی عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده قال نھی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن بیع و شرط۔

یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بیع کے ساتھ شرط ممنوع فرمائی۔

یہ سن کر میں ابن ابی لیلیٰ کے یہاں پہنچا اور ان سے بیان کیا انہوں نے کہا کہ حدثنی ھشام عن عروۃ عن ابیه عن عائشہؓ قالت امرنی رسول الله ان اشتری بریرۃ فاعتقھا فاشترط اھلھا الولاء لنفسھم فقال رسول الله ما کان من شرط لیس فی کتاب الله فھو باطل۔ یعنی حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ میں بریرہ کو خرید کر آزاد کر دوں۔ اس کے مالکوں نے شرط یہ کی کہ ولا ان کی رہے گی۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ جو شرط کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل ہے۔

اب ابن شبرمہ کے پاس آیا، انہوں نے سب کچھ سن لینے کے بعد کہا کہ حدثنی مسعر بن کدام عن محارب بن دثار عن جابر قال بعت النبی بعیرا و شرطت لی حملانه الی المدینة۔ یعنی میں نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ ایک اونٹ بیچا اور میری یہ شرط منظور کی گئی کہ اس پر لد کر مدینہ تک جاؤں گا۔

اس پر، علامہ موصوف نے، اپنے مخصوص انداز میں، چار سطروں میں جو تبصرہ فرمایا ہے، وہ اپنے مقام پر منفرد ہے۔ فرماتے ہیں:۔

مگر اس کا الزام صرف روایات کے اختلاف پر نہیں بلکہ مذہبی انفرادیت پر بھی ہے۔ اگر اجتماعی مرکز فقہ کو اپنے ہاتھ میں رکھتا تو ساری ملت کی ایک ہی فقہ ہوتی اور شخصی فقہوں میں بٹ کر وہ فرقوں میں تقسیم ہو جاتی۔ اور اس مرکزیت کی وجہ سے حدیثوں کی بھی یہ حالت نہ ہوتی۔

جب تک قرآنی مملکت (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) قائم رہی، نہ احادیث کے مجموعے مرتب ہوئے اور نہ ہی مختلف فقہا کی انفرادی فقہیں مرتب اور رائج ہوئیں۔ یہ سب تباہیاں اس خلافت (مرکز) کے باقی نہ رہنے سے آئیں۔

بہرحال ہم یہ کہہ رہے تھے کہ فقہی احکام کے اختلافی ہونے کی وجہ ... اُن احادیث کا اختلاف ہے جن پر فقہی احکام متفرع ہیں۔ اس باب میں سابقہ ایام میں مختلف فرقوں میں جو مباحثے اور مناظرے ہوا کرتے تھے، انہیں چھوڑیئے۔ آج کل وفاقی شرعی عدالت مختلف معاملات میں جو فیصلے دیتی ہے انہیں دیکھئے۔ ان میں ساری بحثیں، احادیث کی پوزیشن اور ان کے باہمی (اور قرآن سے) اختلافات کے گرد گردش کرتی ہیں۔ اور اس کے بعد نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ حکومت کی قائم کردہ .... شرعی عدالت ایک فیصلہ دیتی ہے، اور خود حکومت اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دیتی ہے۔ وفاقی شرعی عدالت کا وہ فیصلہ بھی فقہ اور احادیث پر مبنی ہوتا ہے، اور اس کے خلاف اپیل بھی، فقہ اور احادیث پر مبنی!

اس مقام سے یونہی آگے نہ بڑھ جائیے۔ قرآنِ مجید کے الفاظ ہیں:۔

ایک ایک، دو دو کر کے کھڑے ہو جائیے، اور پھر سوچئے!

علامہ اقبالؒ کی فکر

ایک ..... سوچنے والے ذہن نے اس اہم ترین سوال کے متعلق سوچا تھا، اور اپنی قرآنی بصیرت کی روشنی میں اس کا حل بھی بتایا تھا۔ آپ، علامہ اقبالؒ کے "خطبات تشکیل جدید" میں چھٹا خطبہ دیکھئے۔ اس میں اس سوال پر بڑی تفصیل گفتگو کی گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ اس کا حل بھی بتایا ہے۔ سب سے اہم سوال قانون سازی کا تھا۔ اس باب میں انہوں نے اپنی بحث کو ان الفاظ میں سمیٹا کر پیش کیا کہ

> آیئے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رُو سے قطعاً یہ نہیں ہوتا کہ انسانی فکر مسلوب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے..... قرآن کریم کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عمل ارتقاء ہے، اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی حاصل کر سکتے ہیں، لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔

(ضمناً) علامہ اقبالؒ نے یہ خطبات ۱۹۲۸ء میں دیئے تھے جب ان کی فکر پختہ ہو چکی تھی۔ حال ہی میں میری نظروں سے ان کے ایک مقالہ کا اقتباس گذرا ہے جو ماہنامہ مخزن کی اکتوبر ۱۹۰۴ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ (یوں کہیئے کہ وہ) ہنوز طالب العلم تھے۔ اسے دیکھئے اور پھر اندازہ لگائیے کہ ایک

سوچنے والا ذہن...... چھوٹی سی عمر میں بھی کس طرح صحیح سمت کی طرف رُخ کرتا ہے۔ انہوں نے اس مقالہ میں کہا تھا:۔

حالات زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب آجانے کی وجہ سے بعض ایسی تمدنی ضروریات پیدا ہو گئی ہیں کہ فقہا کے استدلالات جن کے مجموعے کو عام طور پر شریعت اسلامی کہا جاتا ہے، ایک نظرثانی کے محتاج ہیں۔ میرا یہ عقیدہ نہیں کہ مسلّماتِ مذہب میں کوئی اندرونی نقص ہے جس کے سبب سے وہ ہماری موجودہ تمدنی ضروریات پر حاوی نہیں ہیں، بلکہ میرا مدعا یہ ہے کہ قرآن شریف اور احادیث کے وسیع اصولوں کی بنا پر جو استدلال فقہا نے وقتاً فوقتاً کیے ہیں، ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو خاص خاص زمانوں کے لیے واقعی مناسب اور قابلِ عمل تھے، مگر حال کی ضروریات پر کافی طور پر حاوی نہیں ہیں جس طرح اس وقت ہمیں تائیدِ اصولِ مذہب کے لیے ایک جدید کلام کی ضرورت ہے، اسی طرح قانون اسلامی کی جدید تفسیر کے لیے ایک بہت بڑے فقیہہ کی ضرورت ہے جس کے قوائے عقلیہ و تخیلیہ کا پیمانہ اس قدر وسیع ہو کہ وہ مسلّماتِ مذہب کی بنا پر قانونِ اسلامی کو نہ صرف ایک جدید پیرائے میں مرتب اور منظم کر سکے بلکہ تخیل کے زور سے اصول کو ایسی وسعت دے سکے جو حال کے تمدنی تقاضوں کی تمام ممکن صورتوں پر حاوی ہو۔ (قومی زندگی، مخزن، اکتوبر ۱۹۰۴ء)[1]

فقہ کی اس تشکیلِ نو کے لئے انہوں نے، مملکتِ پاکستان کا تصور دیا۔ اس کا بنیادی مقصد انہوں نے جن مختصر الفاظ میں متعین کیا تھا وہ اربابِ فکر و دانش کے لئے دلیلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ "اس سے اسلام کے دامن سے وہ دھبہ دھو دیا جائے گا جو عربی ملوکیت نے اس پر لگا رکھا ہے"۔ غور کیجئے کہ انہوں نے اسلام کے ماضی (کی تاریخ) اور مستقبل (کے تصور) کو کس طرح چار لفظوں میں واشگاف کر کے رکھ دیا تھا؛

تصورِ پاکستان سے مقصود

لیکن اقبالؒ یہ کہہ کر چلا گیا اور اس کے بعد صورت یہ ہو گئی کہ

زاغوں کے تصرف میں ہے شاہیں کا نشیمن!

عربی ملوکیت کا وہ نقش جو پہلے ایک دھبہ کی شکل میں تھا، اب تھیاکریسی کے تصدق، خود اس دامن کا جزو بنایا جا رہا ہے۔ روایات اور فقہ کے وہ اصول و احکام جو مرورِ زمانہ کے ہاتھوں رفتہ رفتہ خود ہی مٹتے جا رہے تھے، انہیں حیاتِ نو (NEW LEASE OF LIFE) عطا کی جا رہی ہے معلوم

---

[1] یہ اقتباس پروفیسر بختیار حسین صدیقی کے اس مقالہ سے ماخوذ ہے جو "احیائے اسلام کی فکری اساس" کے عنوان سے ماہنامہ المعارف (لاہور) کی جون ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اس کے لئے میں محترم مقالہ نگار اور المعارف کا شکر گزار ہوں۔

نہیں، خدا کی کتاب اور انسانی فکر کو جن نئی زنجیروں میں جکڑا جا رہا ہے وہ اُمّت کے سر پر کب تک مسلّط رہیں گی؟ یہ ٹھیک ہے کہ یہ تسلّط ابدیت سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔ سوال صرف وقت کا ہوتا ہے۔ لیکن اس دوران میں اسلام جس قدر مسخ ہو چکا ہوگا، اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟

سرِ دست تو ہم اتنا ہی عرض کر سکتے ہیں کہ جب کبھی قرآن اور انسانی فکر، ان زنجیروں سے آزاد ہوئے، اُمّت کے لئے سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہوگا کہ روایات، سیرت، تاریخ، تفاسیر، فقہ کا جائزہ قرآن کی روشنی میں لے۔ جو اس کے مطابق ہو، اسے قابلِ قبول سمجھے، جو اس کے خلاف نظر آئے، اسے مسترد کر دے۔ اور پھر اُمّت کے مشورہ سے، قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کے .... مطابق، احکام و قوانین کی تشکیل جدید کرے۔ اُس وقت وہ مملکت بھی اسلامی کہلائے گی اور اس کے قوانین بھی احکامِ شریعت۔ لیکن، یہ فریضہ اس انقلابی مردِ مومن کے ہاتھوں ادا ہو سکے گا جو (اقبالؒ کے الفاظ میں) اپنے سینہ میں روحِ عمری رہا لے کر آگے بڑھے اور پوری جرأت و بسالت سے اعلان کرے کہ

حسبنا کتاب اللہ —— ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔ (چوتھا خطبہ)

بسلسلۂ معذرت صفحہ ۶۰ طلوعِ اسلام دسمبر ۱۹۸۴ء

محترم پرویز صاحب کی بحالیٔ صحت (۲۲ نومبر کے ضروری آپریشن کے بعد) بفضلہ تعالیٰ آہستہ آہستہ ہو رہی ہے لیکن کمزوری ابھی باقی ہے۔ اس اثناء میں قارئین کی طرف سے مزید استفسارات مسلسل آتے رہتے ہیں۔ لہٰذا وہ ان سب احباب سے اپنے صحتیاب ہونے تک مزید معذرت خواہ ہیں۔

لاہور کے سامعینِ درس متوجہ ہوں

درسِ قرآن بذریعہ وی سی آر (V-C-R) ہر جمعہ کی صبح ۹ ½ بجے $\frac{25}{B}$ گلبرگ (لاہور) میں ہوتا ہے۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

عورت — قرآن کے آئینے میں

ہم نے اس موضوع پر اکثر و بیشتر لکھا ہے۔ اور بکثرت لکھا ہے۔ علاوہ ان مقالات کے جو وقتاً فوقتاً طلوع اسلام میں شائع ہوتے رہے ہیں، پرویز صاحب کی مستقل تصنیف ــــ طاہرہ کے نام خطوط ــــ اس موضوع پر بڑی معلومات افزا ہے۔ نیز مطالب الفرقان کی مختلف جلدوں میں متعلقہ آیات کی تشریحات مزید تفصیلات در آغوش ہیں۔ اس لئے ہمیں اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی چنداں ضرورت نہ تھی، لیکن حال ہی میں اس موضوع نے ملک میں جو اہمیت حاصل کی تو اس سے متاثر ہو کر، بیشتر قارئین کی طرف سے تقاضے موصول ہوئے کہ طلوع اسلام میں اس موضوع پر ایک جامع مقالہ کی ضرورت ہے جس میں اس کے مختلف گوشوں کو سامنے لایا جائے۔ زرہ امتثال امر مقالہ پیش خدمت ہے جو ظاہر ہے کہ بنیادی طور پر پرویز صاحب کی تصانیف اور طلوع اسلام میں شائع شدہ مقالات پر مبنی ہے۔ چونکہ جو کچھ ہمارے ہاں مذہب کے نام پر پیش کیا جاتا ہے وہ بیشتر، یہودیت اور عیسائیت میں رائج "افسانوں" پر مشتمل ہے اس لئے بغرض تقابل بعض مقامات پر ان کے لٹریچر کے اقتباسات یا حوالے ناگزیر ہو جاتے ہیں۔ ان سے آپ کے سامنے یہ حقیقت آجائے گی کہ جو کچھ ہمارے سامنے اسلام کے نام سے پیش کیا جاتا ہے اس کا سرچشمہ کیا ہے، اور اس کے بعد جب قرآنی حقائق کو سامنے لایا جائے گا، اس سے واضح ہو جائے گا کہ دین کی رُو سے حقیقت کیا ہے۔ واضح رہے کہ ہمارے پیش نظر نہ کسی سے بحث و مباحثہ ہے۔ نہ کسی پر تنقید و تنقیص مقصود۔ ہمارا مقصد صرف قرآنی حقائق پیش کرنا ہے۔ اس سے اگر کسی مروجہ عقیدہ یا کسی کے کسی دعویٰ پر زد پڑتی ہے تو اس کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی، کیونکہ اس باب میں مدعی، قرآن ہے۔ ہم نہیں۔ ہمارا فریضہ قرآن کے دعاوی کو پیش کرنا ہے اور بس۔

ــــــ (۰) ــــــ

عیسائیت میں عورت کا مقام

بائیبل میں کہا گیا ہے کہ آدم اور اس کی بیوی جنت میں تھے۔ شیطان نے آدم کی بیوی کو بہکایا اور آدم اپنی بیوی کی باتوں میں آکر بہک اور بھٹک گیا۔ اس بنا پر عیسائیت گناہِ اوّل کا مجرم عورت کو قرار دیتی ہے اور مرد کو اس سے بری الذمہ ٹھہراتی ہے۔ اس جرم کی بنا پر اس کے نزدیک عورت، دنیا میں تمام مصائب کا سرچشمہ ہے۔ اس لئے انتہائی قابلِ نفرت مخلوق۔ عیسائیت کا مقدس لٹریچر عورت کے

خلاف طعن وتشنیع سے بھرا پڑا ہے۔ ان کے بڑے بڑے (SAINTS) عورت کو ملعون و مردود قرار دینے میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے جو، کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے تجرد کی زندگی بسر کی اور وہ بھی تجرد کی زندگی کو وجہ تقرب خداوندی سمجھتے ہیں۔ انہی کے تتبع میں ان کے ہاں کی (NUNS) بھی تجرد کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ یعنی "جنسی آلائش" سے دور رہتی ہیں۔ دنیائے عیسائیت میں، صدیوں تک یہ مسئلہ زیر بحث رہا کہ عورت میں روح بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ سینٹ پال کا قول ہے کہ "جو عورتیں غیر شادی شدہ ہیں یا بیوہ، میں انہیں تلقین کروں گا کہ میری طرح غیر شادی شدہ رہیں" اس کے بعد اس نے کہا۔

> آدمی عورت سے پیدا نہیں کیا گیا، عورت آدمی سے پیدا کی گئی ہے۔ آدمی عورت کے لئے پیدا نہیں کیا گیا، عورت آدمی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ گرجے میں عورتوں کو خاموش بیٹھے رہنا چاہیئے انہیں بولنے کی اجازت نہیں۔ قانون کی رو سے انہیں مردوں کے مقابلہ میں کم تر درجہ پر رہنا چاہیئے۔ اگر انہیں کسی بات کے معلوم کرنے کی ضرورت پڑے تو گھر جا کر اپنے خاوندوں سے پوچھ لیا کریں۔ عورت کے لئے یہ بات بڑی بے عزتی کی ہے کہ وہ گرجے میں بات کرے
>
> (سینٹ پال)

ایک اور سینٹ (HIEVONYMUS) کا قول ہے کہ "عورت، شیطان کا دروازہ، برائیوں کی راہ اور بچھو کا ڈنک ہے"۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ عورتیں بہشت میں نہیں جا سکتیں۔ اس سے یہ دشواری پیش آئی کہ پھر حضرت مریمؑ کے متعلق کیا کیا جائے۔ سینٹ (THOMAS) نے اس کا حل یہ بتایا کہ حضرت مریمؑ اور ان کے ساتھ ان تمام عورتوں کو جو کفارہ پر ایمان رکھنے کی بنا پر بہشت میں جانے کے قابل قرار دی جائیں گی۔ مرد بنا دیا جائے گا۔ بلکہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہاں تذکیر و تانیث کا امتیاز ہی اُٹھ جائے گا۔ ؎۱

عیسائیوں کے ہاں تو ایسے عقائد پیدا ہونے ہی تھے لیکن انتہائی بدقسمتی کہ خود ہم (مسلمان) بھی اس سے محفوظ نہ رہے۔ ہم نے ان عقائد کو ان سے مستعار لیا اور پھر انہیں اسلام کا جزو بنا کر اپنے لٹریچر میں شامل کر لیا۔ قرآن کریم نے واضح طور پر بتا دیا تھا کہ شیطان نے آدم کی بیوی (عورت) کو نہیں بہکایا تھا بلکہ آدم اور اس کی بیوی (مرد اور عورت) دونوں کو بہکایا تھا۔ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ ..... (۲/۳۶) "شیطان نے مرد اور عورت دونوں کو (ھُمَا) بہکایا"۔ (قصۂ آدم کی قرآنی تصریحات پرویز صاحب کی کتاب "ابلیس و آدم" یا "مطالب الفرقان" جلد دوم میں ملیں گی)۔

——— (۰) ———

؎۱ ان امور کی تفصیل کے لئے دیکھئے کتاب :-

"WOMAN IN ANTIQUITY BY CHARLES SELTMAN"

عورت کی پیدائش

عیسائیت کا عقیدہ یہ ہے کہ پہلے آدم کو پیدا کیا گیا اور جب اس نے تنہائی محسوس کی تو پھر اس کی پسلی سے اس کی بیوی نکالی گئی۔ آپ غور کیجئے کہ یہی تصور خود ہمارے ہاں بھی کس طرح حقیقت تسلیم کر لیا گیا۔ تفسیر ابن کثیر کا شمار ہمارے ہاں کی مستند ترین تفاسیر میں ہوتا ہے۔ اس میں پیدائش آدم کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ

> حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ ابلیس کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کا علم ظاہر کر کے پھر ان پر اونگھ ڈال دی گئی اور ان کی بائیں پسلی سے حضرت حوّا کو پیدا کیا۔ جب آنکھ کھول کر حضرت آدم نے انہیں دیکھا تو اپنے خون اور گوشت کی وجہ سے اُن سے انس و محبت پیدا ہوئی۔ پھر پروردگار نے انہیں ان کے نکاح میں دیا اور جنّت میں رہائش کا حکم عطا ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کے جنت میں داخل ہو جانے کے بعد حضرت حوّا پیدا کی گئیں۔ حضرت ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ وغیرہ صحابہؓ سے مروی ہے کہ ابلیس کو جنت سے نکالنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں جگہ دی گئی لیکن تن تنہا تھے۔ اس وجہ سے ان کی نیند میں حضرت حوّا کو ان کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ جاگ کر انہیں دیکھ کر پوچھنے لگے کہ تم کون ہو کیوں پیدا کی گئی ہو؟ حضرت حوّا نے فرمایا کہ میں ایک عورت ہوں اور آپ کے ساتھ رہنے اور تسکین کے لئے پیدا کی گئی ہوں۔ ط۱

دوسری جگہ ہے کہ

> صحیح حدیث میں ہے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور سب سے بلند پسلی سب سے زیادہ ٹیڑھی ہے۔ پس تو اگر اسے سیدھی کرنے کی کوشش کرے گا تو تُو اسے توڑ دے گا اور اگر اس میں کچھ کجی باقی چھوڑتے ہوئے فائدہ اٹھانا چاہے گا تو بیشک فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ط۲

اس تفسیر اور روایات کی رُو سے (جن کے متعلق بدقسمتی سے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں، حالانکہ ان کے وضعی ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہ جاتا)۔ ایک تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت کا وجود مقصود بالذّات نہیں۔ وہ مرد کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ اور دوسرے یہ کہ چونکہ وہ ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے، اس لئے وہ سیدھی ہو ہی نہیں سکتی۔ جو شخص اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرے گا وہ اسے توڑ دے گا۔ یعنی یہ ٹوٹتے ٹوٹ جائے گی لیکن سیدھی نہیں ہو گی۔

اس کے بعد آپ دیکھئے کہ اس "ٹیڑھی پسلی" کو سیدھا کرنے کے لئے کس قسم کی (وضعی) روایات حضور

ط۱ ترجمہ اُردو مولانا محمد جونا گڑھی۔ پارہ اوّل۔ صفحہ ۸۵۔

ط۲ " " " " ۔ پارہ چہارم۔ صفحہ ۶۶۔

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی حیثیت سے ہمارے ہاں راہ پاگئیں اور ہماری تفسیروں کا حصہ بن گئیں۔ سورۃ النساء میں ایک آیت ہے: اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ..... (۴/۳۴)۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے۔ "مرد عورتوں پر حاکم یا داروغہ ہیں"۔ [1] اس ترجمہ کا مدار ان روایات پر ہے جو اس ضمن میں ہمارے ہاں متداول ہیں۔ تفسیر ابن کثیر (سورۃ النساء پارہ پنجم) میں ہے کہ

> حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ عورتوں کو مردوں کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ ایک عورت نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے خاوند کی شکایت کی کہ اس نے اسے تھپڑ مارا ہے۔ پس آپ نے اسے بدلہ لینے کا حکم دیا ہی تھا جو یہ آیت اتری، اور بدلہ نہ دلوایا گیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک انصاری اپنی بیوی صاحبہ کو لئے ہوئے حاضر خدمت ہوئے۔ اس عورت نے حضورؐ سے کہا کہ یا رسول اللہ! میرے اس خاوند نے مجھے تھپڑ مارا جس کا نشان اب تک میرے چہرے پر موجود ہے۔ آپ نے فرمایا اسے حق نہ تھا۔ وہیں یہ آیت اتری کہ ادب سکھانے کے لئے مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ میں نے اور چاہا تھا اللہ نے اور چاہا۔ (ص۲)۔ اردنا امرًا و اراد اللہ غیرہ۔
>
> (تفسیر المنار۔ مفتی محمد عبدہ۔ جلد ۵۔ ص۷۴)

آگے بڑھنے سے پیشتر، ذرا دل تھام کر سوچئے کہ اس فقرہ کی زد کہاں جا کر پڑتی ہے۔ یعنی (اس روایت کی رو سے) حضورؐ نے فرمایا۔ کہ میں تو چاہتا تھا کہ عورتوں کو بدلہ لینے کا حق مل جائے لیکن جب خدا ہی نہ چاہے تو میں کیا کروں [2] (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)۔ اسی تفسیر میں آگے چل کر لکھا گیا ہے کہ

> ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ خدا کی لونڈیوں [3] کو مارو نہیں۔ اس کے بعد ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق آئے اور عرض کرنے لگے یا رسول اللہ! عورتیں آپ کے اس حکم کو سن کر اپنے مردوں پر دلیر ہو گئی ہیں۔ اس پر حضورؐ نے انہیں مارنے کی اجازت دے دی۔ اب مردوں کی طرف سے دھڑا دھڑ مار پیٹ شروع ہوئی اور بہت سی عورتیں شکایتیں لے کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں تو آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ سنو! میرے پاس عورتوں کی فریاد پہنچی ہے یاد رکھو، تم میں سے جو اپنی عورتوں کو زد و کوب کرتے ہیں وہ اچھے آدمی نہیں۔
>
> حضرت اشعث فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت فاروق اعظمؓ کا مہمان ہوا اتفاقاً

---

[1] اس کا صحیح مفہوم ذرا آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔

[2] ان حضرات کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ حضورؐ کا ہر قول، وحیٔ خداوندی پر مبنی ہوتا تھا۔ وہ ذرا سوچیں کہ اس عقیدہ کی رو سے اس ارشادِ نبوی کا کیا مفہوم ہوگا کہ ہم نے کچھ اور چاہا تھا اور خدا نے اس کے خلاف حکم دے دیا۔

[3] بات بیویوں کی ہو رہی ہے۔ کیا انہی کو "لونڈیاں" کہہ کر پکارا گیا ہے۔

اس روز میاں بیوی میں کچھ ناچاکی ہوگئی۔ اور حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی صاحبہ کو مارا پھر مجھ سے فرمانے لگے۔ اشعث رضؓ! تین باتیں یاد رکھ جو میں نے آنحضرتؐ سے سن کر یاد رکھی ہیں ایک تو یہ کہ مرد سے یہ نہ پوچھا جائے کہ اس نے اپنی عورت کو کس بنا پر مارا ہے، دوسری یہ کہ وتر پڑھے بغیر سونا مت اور تیسری بات راوی کے ذہن سے نکل گئی۔ (صفحہ ۲۱-۲۰)

اسی تفسیر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو حکم کر سکتا کہ ماسوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم کرتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ بخاری شریف میں ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلائے اور وہ انکار کردے تو صبح تک فرشتے اس پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں صحیح مسلم میں ہے کہ جس رات کوئی عورت بطور روٹھنے کے اپنے خاوند کے بستر کو چھوڑے رہے تو صبح تک اللہ تعالیٰ کی رحمت کے فرشتے اس پر لعنتیں کرتے رہتے ہیں۔ (صفحہ ۲۱)

یہ تو (ہمارے ہاں کے مروّجہ مذہب کی رُو سے) عورت کی حیثیت ہے مردوں کے مقابلہ میں۔ جہاں تک عورتوں کے گناہوں اور برائیوں کے سرچشمہ ہونے کا تعلق ہے اس سے بھی ہماری کتب روایات بھری پڑی ہیں۔ مثلاً (احادیث کی صحیح ترین کتاب) بخاری شریف میں کہا گیا ہے کہ

حضرت ابوہریرہؓ مروی ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت کبھی نہ سڑتا اور اگر حوا نہ ہوتیں تو کوئی عورت اپنے شوہر سے خیانت نہ کرتی۔ (بخاری۔ کتاب پیدائش انبیاءؑ)

دوسری روایت ہے:۔

حضورؐ نے فرمایا کہ میرے پیچھے، مردوں پر کوئی فتنہ عورتوں سے زیادہ باعثِ مضرت نہیں۔ (بخاری۔ کتاب النکاح)

ایک اور روایت میں ہے کہ

حضورؐ نے فرمایا کہ نحوست تین چیزوں میں ہے، عورت، گھر، گھوڑا۔ (بخاری۔ کتاب النکاح)

اسی سلسلہ میں ایک اور روایت ہے کہ

حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے جنت میں دیکھا تو وہاں اکثریت فقیروں کی پائی گئی اور دوزخ میں دیکھا تو اکثریت عورتوں کی نظر آئی۔ ؎ (بخاری۔ کتاب الانبیاء)

صاف نظر آرہا ہے کہ اس مقصد کے پیشِ نظر کہ مسلمان اس پر اعتراض نہ کرسکیں کہ بائیبل میں یا عیسائیت کے

؎ ایک طرف کہا جاتا ہے کہ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ "جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے"۔ اور دوسری طرف بتایا جاتا ہے کہ حضورؐ نے جہنم میں عورتوں کی اکثریت دیکھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ عورتیں، دنیا میں "مائیں" نہیں تھیں؟ اگر مائیں تھیں ——— اگر سب کی سب نہیں تو ان میں سے بیشتر مائیں ہوں گی ——— تو پھر اس کا کیا جواب کہ ان کے پاؤں کے نیچے تو جنت تھی لیکن وہ خود جہنم میں تھیں؟ صاف نظر آتا ہے کہ ایسی وضعی روایات کو پیش کرنے والے جب عورت کے متعلق بات کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں بیوی ہوتی ہے۔ عورت کی کوئی اور حیثیت نہیں ہوتی۔

یہ روایات وضعی ہیں

عقائد کی رُو سے عورت کو کس قدر قابلِ نفرت ٹھہرایا گیا ہے، یہودیوں اور عیسائیوں نے خاص سازش کے تحت اس قسم کی روایات وضع کیں اور انہیں ہماری کتبِ احادیث میں داخل کر دیا۔ انہوں نے تو ایسا ہی کیا تھا لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہم ان وضعی روایات کو احادیثِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قرار دے کر سینے سے لگائے پھرتے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ اس قسم کی روایات کی، حضور رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کس طرح صحیح قرار پاسکتی ہے۔ یہی نہیں کہ خود نہیں سوچتے، جو "سوختہ بخت" یہ کہہ دے کہ ایسی روایات کی نسبت حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح معلوم نہیں ہوتی، اُسے "منکرِ حدیث" قرار دے کر دائرہ اسلام سے خارج کر دیتے ہیں!

———(۰)———

اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (۴/۳۴)

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ عورتوں کو مارنے پیٹنے کی تائید میں یہ آیت پیش کی جاتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس آیت کا قرآنی مفہوم سامنے لایا جائے۔ یہ پوری آیت اور اس کا مروجہ ترجمہ یوں ہے:-

اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِىْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا - (۴/۳۴)

اس آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:-

مرد حاکم ہیں اوپر عورتوں کے بہ سبب اس کے کہ بزرگی دی اللہ نے بعضے ان کے کو اوپر بعض کے۔ اور بہ سبب اس کے کہ خرچ کرتے ہیں مالوں اپنے سے، پس نیک بخت عورتیں فرماں بردار ہیں۔ نگہبانی کرنے والی ہیں بیچ غائب کے ساتھ محافظت اللہ کے۔ اور جو عورتیں کہ تم ڈرتے ہو چڑھائی ان کی سے۔ پس نصیحت کرو ان کو، اور چھوڑو ان کو بیچ خوابگاہ کے۔ اور مارو ان کو۔ پس اگر کہا مانیں تمہارا پس مت ڈھونڈو اوپر ان کے راہ، تحقیق اللہ ہے بلند بڑا۔ (ترجمہ شاہ رفیع الدینؒ)

اب اس آیت کے قرآنی مفہوم کی طرف آیئے:-

آیت کا صحیح مفہوم

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ اس آیت میں میاں اور بیوی کے متعلق بات نہیں ہو رہی۔ اَلرِّجَالُ (عام

مردوں) اور اَلنِّسَآءُ (عام عورتوں) کے متعلق بات ہو رہی ہے۔ اس لئے یہاں گفتگو یہ ہے کہ معاشرہ میں مردوں اور عورتوں کے فرائض مفوضہ کیا ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ عورتیں اپنے طبیعی فرائض کی سرانجام دہی کی وجہ سے اکثر اوقات اکتسابِ رزق سے معذور ہو جاتی ہیں۔ ان کے برعکس مردوں کا سارا وقت اس کے لئے فارغ ہوتا ہے۔ لہٰذا، قرآن نے تقسیم کار کے اصول کے مطابق، مردوں کا فریضہ یہ بتایا کہ وہ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ہیں۔ لغت میں قَامَ الرَّجُلُ عَلَى الْمَرْأَةِ کے معنے دیئے ہیں۔ مانَہا۔ یعنی اس نے روزی مہیا کی۔ قوام عَلَيْهَا کے معنی ہیں مائن لہا۔ یعنی اس کی روزی مہیا کرنے والا۔ اس سے آیت کا مفہوم واضح ہو گیا۔ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ یعنی معاشرہ میں مردوں کے ذمے یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کے لئے اکتساب رزق کریں۔ اس لئے کہ (بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ) تقسیم کار کے اصول کی بنا پر ایک قسم کی استعداد مردوں کو زیادہ دی گئی ہے اور دوسری قسم کی استعداد عورتوں کو۔ اور چونکہ مردوں کا سارا وقت اکتسابِ رزق کے لئے فارغ ہوتا ہے اور عورتیں اس سے اکثر اوقات معذور ہو جاتی ہیں، اس لئے مردوں کا کمایا ہوا رزق، عورتوں کی ضروریات کی کفالت کرتا ہے۔ (بِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ) اس سے عورتوں کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی جائیں گی اور ان کی صلاحیتیں نشوونما پائیں گی ــــ (فَالصّٰلِحٰتُ) اور انہیں فراغت نصیب ہو جائے گی کہ وہ اپنی خاص صلاحیتوں کو اسی مصرف میں لائیں جس کے لئے وہ پیدا کی گئی ہیں۔ یہ معنی ہیں قٰنِتٰتٌ کے۔ سِقاء قَنِيت اس مشکیزے کو کہتے ہیں جس میں پانی بھرنے کے بعد، اسے اس طرح اچھی طرح سی کر بند کر دیا جائے کہ وہ اپنا پانی محفوظ رکھے۔ راستے میں کہیں نہ گرائے اور جہاں ضرورت ہو وہاں اس کا منہ کھل سکے۔ اگر عورتوں کو اکتسابِ رزق کرنا پڑے تو جس مقصد کے لئے انہیں خاص صلاحیتیں دی گئی تھیں وہ مقصد پورا نہیں ہو گا۔ اس کے بعد دو لفظوں میں اس نکتہ کو اور بھی واضح کر دیا جب فرمایا کہ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ۔ یعنی جب اللہ کے قانون نے اس طرح ان کی حفاظت (پرورش) کا سامان بہم پہنچا دیا تو انہیں اطمینان اور فرصت مل گئی کہ وہ اس چیز کی حفاظت کر سکیں جو پوشیدہ طور پر ان کے سپرد کی گئی ہے۔ (یعنی جنین کی حفاظت)۔

یہاں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآن، عورتوں کے خصوصی فرائض اور ان سے متعلقات امور کا تذکرہ نہایت سنجیدہ استعاروں میں کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے مروجہ تراجم اور تفاسیر کی رُو سے بات یوں بیان کی جاتی ہے کہ مرد عورتوں پر حاکم اور داروغہ ہیں کیونکہ وہ ان پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ (ان کے برعکس) نیک بیویاں (فَالصّٰلِحٰتُ) کا شیوہ یہ ہے کہ وہ فرمانبردار (قٰنِتٰتٌ) ہوتی ہیں اور مرد کی غیر حاضری میں اپنی عصمت کی حفاظت کرتی ہیں۔ یعنی مردوں کا کام یہ ہے کہ عورتوں پر حکومت کریں۔ اور عورتوں کا کام یہ ہے کہ وہ مردوں کی فرمانبرداری اور عصمت کی حفاظت کریں۔ گویا صٰلِحٰتٌ اور قٰنِتٰتٌ اور حٰفِظٰتٌ ہونا صرف عورتوں کے لئے ہے۔ حالانکہ قرآن نے سورۂ احزاب (۳۳/۳۵) میں یہ

سب خصوصیات مردوں اور عورتوں دونوں میں مشترک طور پر بیان کی ہیں۔ اس لئے اگر احکام الٰہیہ کا "فرماں بردار" ہونا عورت کے لئے ضروری ہے تو قرآن کی رُو سے مرد کے لئے بھی ضروری ہے۔ لہٰذا، یہ مفہوم کہ مرد کمانے اور حکومت کرنے کے لئے ہیں، اور عورتیں، مردوں کی فرمانبرداری کرنے کے لئے، اس اعتبار سے بھی غلط ہے۔ مرد اور عورت کا باہمی تعلق رفاقت کا ہے اور رفاقت میں ایک کی حکومت اور دوسرے کی فرمانبرداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے رفیق (زوج) ہوتے ہیں اور قانونِ خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں۔ خود لفظ زوج ہی میں مکمل موافقت اور کامل رفاقت کا مفہوم پنہاں ہے۔

اب آگے بڑھیے۔ آیت کا باقی ماندہ حصہ یہ ہے۔ (وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ) چونکہ ہماری تفسیروں میں یہ فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ مرد کا کام عورت پر حکومت کرنا اور عورت کا کام مرد کی فرمانبرداری ہے، اس لئے باقیماندہ آیت کا مفہوم، اسی کی تائید میں، یہ لیا گیا کہ اگر بیوی، مرد کی فرمانبرداری نہ کرے تو وہ پہلے اسے سمجھائے بجھائے، پھر اس سے باہمی تعلقات منقطع کرے۔ اور اس پر بھی کام نہ چلے تو اُسے مارے، پیٹے۔

عورتوں کو مارنا

لیکن، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہاں گفتگو میاں بیوی کے متعلق نہیں ہو رہی، عام مردوں اور عورتوں کے فرائض کے متعلق ہو رہی ہے۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ تقسیم عمل کے اصول کے مطابق، مردوں کا فریضہ یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ اکتسابِ رزق کریں اور عورتیں، رزق کی طرف سے یوں مطمئن ہو جانے کے بعد اپنے خصوصی وظائفِ حیات کو بطریقِ احسن سرانجام دیں۔ اس کے بعد کہا گیا کہ اگر عورتیں ان انتظامات کے باوجود (جن کی رُو سے وہ اکتسابِ رزق کی طرف سے مطمئن ہو جاتی ہیں) معاشرہ کے اس نظم اور تقسیم کار کے اصول سے بلا عذر سرکشی اختیار کریں (جیسا کہ آجکل یورپ کے بعض ممالک میں ہو رہا ہے) تو معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس قسم کی فوضویت (ANARCHY) کو روکے۔ اس لئے کہ اگر عورتوں نے مرد بننے کے چاؤ میں، بلا عذر، اپنے فرائض کو چھوڑ دیا تو نسلِ انسانی کا سلسلہ ہی منقطع ہو جائے گا۔ اس کے لئے کہا گیا کہ معاشرہ ایسا انتظام کرے کہ پہلے تو اس قسم کی ذہنیت رکھنے والی عورتوں کو سمجھانے کی کوشش کی جائے کہ ان کی یہ روش معاشرہ کے لئے کس قدر تباہی کا موجب ہے۔ اگر اس پر بھی وہ باز نہ آئیں تو پھر انہیں ان کی خوابگاہوں میں چھوڑ دیا جائے۔ یہ ایک قسم کی نظربندی . . . . (INTERNMENT) کی سزا ہوگی۔ اور اگر وہ اس پر بھی سرکشی سے نہ رکیں تو پھر انہیں عدالت کی طرف سے بدنی سزا (CORPORAL PUNISHMENT) بھی دی جا سکتی ہے۔

واضح رہے کہ عورت کو نسل کشی کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ مقصد اس ارشادِ خداوندی کا یہ ہے کہ نسل کشی کے خلاف سرکشی کی تحریک نہ پیدا ہونے دی جائے۔

یہاں ضمناً یہ وضاحت ضروری ہے کہ قرآنِ کریم نے اسلامی نظام کے لئے مملکت کا وجود لاینفک قرار دیا ہے۔ لیکن اس نے مملکت۔ حکومت۔ نظامِ عدل اور اس کی جزئیات۔ عدالت وغیرہ اصطلاحات استعمال نہیں کیں۔

چونکہ وہ نظامِ مملکت کی ذمہ داری تمام اُمت کے سر پر ڈالتا ہے اس لئے وہ ان تمام امور کی سرانجام دہی کے لئے (جو آج کل حکومت کے مختلف شعبوں کی طرف سے سرانجام دیئے جاتے ہیں) صرف کُم (تم) کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ یا (ہم) کا لفظ۔ مثلاً وہ سرقہ کی سزا کے لئے کہتا ہے کہ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا...... (۵/۳۸) "تم سارق مرد اور سارقہ عورت کے ہاتھ کاٹ ڈالو"۔ ظاہر ہے کہ سرقہ کے ملزموں کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوگا۔ جرم ثابت ہونے پر سزا کا فیصلہ بھی عدالت کی طرف سے ہوگا، اور اس سزا پر عمل درآمد حکومت کی انتظامیہ کی طرف سے، لیکن قرآن کریم نے نہ عدالت کا ذکر کیا ہے، نہ انتظامیہ کا۔ صرف "تم" کہا ہے۔ "تم" سے مراد یہ نہیں کہ معاشرہ میں ہر ایک (یا مستغیث) کو اس کا حق حاصل ہوگا کہ وہ خود ہی چور کے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ اس سے واضح ہے کہ آیۂ زیرِ نظر (۴/۳۴) میں مردوں (خاوندوں) کو اس کا حق نہیں دیا گیا کہ وہ بیویوں کو پیٹنا شروع کر دیں۔ ایسا فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہوگا۔

یہ ہے صحیح مفہوم اس آیت کا جس کی رُو سے ہمیں بتایا یہ جاتا ہے کہ خاوند اپنی بیویوں پر حاکم اور داروغے ہیں اور انہیں حق حاصل ہے کہ وہ بیویوں کو اپنا محکوم اور مغلوب رکھیں۔ قرآن تو کسی انسان کو بھی اس کا حق نہیں دیتا کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے۔

(٠)

مرد اور عورت ہمدوش

قرآن کریم نے انسان ہونے کی جہت سے کس طرح مردوں اور عورتوں کو یکساں مقام پر رکھا ہے اس کے متعلق اصولی طور پر گفتگو مقالہ کے اخیر میں کی جائے گی۔ اس مقام پر چند ایک آیات درج کی جاتی ہیں، جن سے واضح ہوگا کہ قرآن کریم کس طرح مصافِ زندگی کے ہر گوشے اور ہر شعبے میں، مردوں اور عورتوں کو ہم دوش اور ہم قدم قرار دیتا ہے۔ مثلاً اس نے سورۂ احزاب میں کہا ہے:۔

إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ
وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ
وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ
وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ
الذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (۳۳/۳۵)

"اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ قانونِ خداوندی کی اطاعت سے اپنی ذات کی تکمیل کر سکتے ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے (اَلْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ)۔ اگر مرد اس پارٹی (جماعت) کے رکن بن سکتے ہیں جو خدا کے قانون کے اٹل نتائج پر یقین رکھتے ہوئے امنِ عالم کی ذمہ دار ہو تو عورتیں بھی اس جماعت کی اسی طرح رکن ہو سکتی ہیں۔ (اَلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ)۔ اگر مردوں میں یہ صلاحیت

ہے کہ وہ اپنی استعداد کو اس طرح سنبھال کر رکھیں کہ اِن کا استعمال صرف قانون خداوندی کے مطابق ہو تو یہی صلاحیت عورتوں میں بھی ہے (اَلْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ)۔ اگر مرد اپنے دعوئ ایمان کو سچ کر دکھانے کے اہل ہیں، تو عورتیں بھی اس کی اہل ہیں (اَلصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ)۔ اگر مرد ثابت قدم رہ سکتے ہیں تو عورتیں بھی رہ سکتی ہیں۔ (اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ)۔ اگر مرد اِس خصوصیت کے حامل ہو سکتے ہیں کہ جوں جوں اُن کی صلاحیتیں بڑھتی جائیں، وہ شاخ ثمردار کی طرح قانون خداوندی کی اطاعت میں جھکتے چلے جائیں، تو یہ خصوصیت عورتوں میں بھی ہے (اَلْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ)۔ اگر مردوں میں ایثار کا مادہ ہے تو عورتوں میں بھی ہے۔ (اَلْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ)۔ اگر مرد اپنے آپ پر ایسا کنٹرول رکھ سکتے ہیں کہ انہیں جہاں سے روکا جائے وہ رُک جائیں تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے۔ (اَلصّٰٓئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ)۔ اگر مرد اپنے جنسی میلانات کو ضوابط کی پابندی میں رکھ سکتے ہیں تو عورتیں بھی ایسا کر سکتی ہیں۔ (اَلْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ)۔ اگر مرد قانونِ خداوندی کو شعوری طور پر سمجھنے اور اسے ہر وقت پیش نظر رکھنے کے اہل ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی اہلیت ہے (اَلذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ)۔ جب یہ صلاحیتیں، دونوں میں موجود ہیں تو ان کے نتائج بھی دونوں کے لئے یکساں طور پر موجود ہونے چاہئیں۔ فلہٰذا نظام خداوندی میں دونوں کے لئے حفاظت کا سامان اور اجرِ عظیم موجود ہے۔ (اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا)۔

قرآن کی ان تفاصیل پر غور کریں اور پھر سوچیں کہ زندگی کا وہ کونسا گوشہ ہے جس کے متعلق یہ کہا گیا ہو کہ مرد میں تو اس کی صلاحیت ہے اور عورت میں نہیں۔ مرد تو یہ کچھ کر سکتا ہے اور عورت نہیں کر سکتی۔ مرد تو یہ کچھ بن سکتا ہے لیکن عورت نہیں بن سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ مرد اور عورت دونوں کے صلاحیت بخش اعمال نتیجہ خیز ہوں گے اور دونوں دوش بدوش جنت میں داخل ہوں گے۔ گھر کی جنت میں، معاشرے کی جنت میں اور پھر اس زندگی کے بعد، اگلی زندگی کی جنت میں (وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ($\frac{4}{124}$)۔ ان میں سے کسی کے کام کا نتیجہ ضائع نہیں ہوگا۔ (لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ($\frac{3}{194}$)

اس میں شبہ نہیں کہ تقسیم کار کے اصول کے مطابق زندگی کے کچھ وظائف ایسے ہیں جو عورتوں کے لئے مختص ہیں۔ (مثلاً جنین کی حفاظت، بچہ کی پرورش اور ابتدائی تربیت وغیرہ) اس کے لئے اس کی جسمانی ساخت کے بعض گوشے بھی مردوں سے مختلف ہیں اور نفسیاتی طور پر بھی بعض ایسی منفرد خصوصیات جو اس کے ان فرائضِ زندگی کی ادائیگی کے لئے معاون بن سکیں۔ مثلاً بچے کے لئے محبت اور پیار کا جذبہ اور ایثار و قربانی کی صلاحیت۔ ایثار اس قسم کا کہ جنین، ماں کے خون سے مترتب ہوتا ہے۔ اس کی پیدائش کے بعد اس کی پرورش کا انحصار ماں ہی کے عطا کردہ رزق (دودھ) پر ہوتا ہے۔ ماں میں سہار اور برداشت کا مادہ اس قدر فراواں ہوتا ہے کہ وہ بچے کے ہر قسم کے تقاضہ کو نہایت تحمل اور خندہ پیشانی

سے پورا کئے جاتی ہے اور اس کے لئے اس سے کسی صلہ یا معاوضہ کی متمنی نہیں ہوتی۔ یہ، اور اسی قسم کی دیگر خصوصیات ہیں جن میں عورت منفرد ہوتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس میں زندگی کے دوسرے گوشوں میں کارفرمائی کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ قرآنِ کریم نے اُمتِ مسلمہ (مملکتِ اسلامیہ) کا سب سے اہم فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرار دیا ہے۔ اس میں اس نے مرد اور عورت دونوں کو برابر کا شریک ٹھہرایا ہے۔ سورۃ توبہ میں ہے:۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (۹/۷۱)

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق اور دوست ہیں۔ یہ دونوں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ نظامِ صلوٰۃ قائم کرتے اور زکوٰۃ دہی کا اہتمام کرتے ہیں۔ یعنی یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جنہیں اللہ اپنی رحمتوں کے سایۂ عاطفت میں رکھے گا اور یہ سب اس کی بے پایاں قوت و حکمت کی رُو سے ہوگا۔

آپ سوچئے کہ اس سے بڑھ کر (مردوں اور عورتوں کی) مساوات کی شہادت اور کونسی ہو سکتی ہے۔ واضح رہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر وعظ و نصیحت کا نام نہیں۔ یہ حکومت کا فریضہ ہے۔ سورۃ الحج میں ہے کہ

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ (۲۲/۴۱)

یہ (مومنین) وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں حکومت حاصل ہوگی تو یہ اقامت الصّلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں گے۔ اور تمام امور کا آخری فیصلہ قوانینِ خداوندی کی رُو سے ہوگا۔

اب ظاہر ہے کہ جب آیت (۹/۷۱) میں، مردوں اور عورتوں، دونوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیں گے، تو ظاہر ہے کہ عورتیں بھی امورِ مملکت میں برابر کی شریک ہو سکتی ہیں۔

(۰)

حقوق و فرائض

جہاں تک مردوں (خاوندوں) اور عورتوں (بیویوں) کے حقوق و فرائض کا تعلق ہے قرآنِ کریم نے اس عظیم حقیقت کو چار الفاظ میں اس جامعیت سے سمٹا کر رکھ دیا ہے کہ بصیرت اس پر وجد کرتی ہے۔ فرمایا:۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۔۔۔۔ (۲/۲۲۸)

جس قدر عورتوں کی ذمہ داریاں ہیں اسی قدر ان کے حقوق ہیں۔

یعنی جو ذمہ داری بھی ان پر عائد کی جائے، اس کے مقابل میں ان کا ایک حق ثبت ہو جاتا ہے ـــــ ہر ذمہ داری کے بالمقابل ایک حق ـــــ فرمایئے! اس سے بڑھ کر مساوات کیا ہو سکتی ہے؟

لیکن آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ وہی آیت جس کی رُو سے قرآنِ کریم نے عورت اور مرد کے حقوق اور فرائض کو یکساں قرار دیا ہے، یہ حضرات اسے اپنے اس دعوے کے ثبوت کے لئے بطور دلیل پیش کرتے ہیں کہ مردوں کے مدارج عورتوں کے مقابلہ میں بلند ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی دلچسپ بھی ہے اور حسرت آمیز بھی۔ وہ کہتے ہیں کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ کے بعد ہے: وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۔۔۔۔ (۲/۲۲۸) جس کے (ان کے نزدیک) معنی ہیں۔ "مردوں کو عورتوں پر فضیلت حاصل ہے"۔ یا یہ کہ مردوں کے درجات عورتوں کی بہ نسبت بلند ہیں۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ اگر یہ کہا جائے کہ عورتوں اور مردوں کے حقوق اور فرائض ایک جیسے ہیں۔ لیکن مردوں کو عورتوں پر فضیلت حاصل ہے تو یہ کھلا ہوا تضاد ہوگا۔ اگر ان کے حقوق و فرائض مساوی ہیں تو پھر ایک جنس کو دوسری پر فضیلت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ اور ایک کے درجات بلند کیسے ہو سکتے ہیں؟ قرآن کریم نے دَرَجَةٌ کہا ہے جس کے معنی ایک درجہ کے ہیں سوال یہ ہے کہ وہ ایک درجہ کیا ہے جو عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کو حاصل ہے؟ اس کا جواب پوری آیت سامنے لانے سے مل جاتا ہے۔ آیت یوں ہے:۔

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ ۚ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَن يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِن كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَٰلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا ۚ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۲/۲۲۸)

طلاق یافتہ عورتوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو (نکاحِ ثانی کے لئے) تین حیض کے عرصہ تک روکے رکھیں (جسے عدّت کی مدّت کہتے ہیں)۔۔۔۔۔ (اس کے بعد عدّت کی تفصیلات دی گئی ہیں اور پھر کہا گیا ہے کہ) یہ ایک بات ہے جس میں عورت کے مقابلہ میں مرد کی پوزیشن ایک گونہ (ADVANTAGEOUS) ہے۔ یعنی عورت کے لئے عدّت ہے۔ مرد کے لئے عدّت نہیں۔ ورنہ، قانونِ خداوندی کی رُو سے مرد اور عورت کے حقوق اور فرائض یکساں ہیں۔

یہ ہے وہ آیت جس کی رُو سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مردوں کو عورتوں پر افضلیت حاصل ہے۔

(۰)

مردوں اور عورتوں کی مساوات کے خلاف دو اعتراضات اور بھی کئے جاتے ہیں۔ یعنی:۔

(i) وراثت میں لڑکی کا حصہ لڑکے سے آدھا ہے، اور

(ii) شہادت کے لئے دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر قرار دیا گیا ہے۔

وراثت میں لڑکی کا حصہ

جہاں تک وراثت کا تعلق ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔ (ملاحظہ ہو 4/11) جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، قرآن کریم کی رو سے ایک ایسا معاشرہ قائم ہوتا ہے جس میں اکتسابِ رزق کی ذمہ داری بنیادی طور پر مرد کے ذمے ہوتی ہے کیونکہ ان فرائض و واجبات کی ادائیگی سے جو بنیادی طور پر عورت کے ذمے ہوتے ہیں، عورت کو بالعموم اتنی فرصت نہیں مل سکتی کہ وہ اکتسابِ رزق کا بوجھ اٹھا سکے۔ اب ظاہر ہے کہ جس معاشرہ میں اکتسابِ معاش کی ذمہ داری بنیادی طور پر مرد کے سر پر ہو اس میں معاشی اسباب کی تقسیم میں مرد کا حصہ یقیناً زیادہ ہونا چاہیئے۔ یہ وجہ ہے کہ ترکہ میں لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر رکھا گیا ہے۔ لڑکیوں کے ذمہ نہ اپنے اخراجات کی کفالت ہوتی ہے نہ اپنے خاندان کے رزق کی کفالت۔ اس کے برعکس، لڑکے نے اپنے لئے بھی اکتسابِ رزق کرنا ہوتا ہے اور اپنے بیوی بچوں کے لئے بھی۔ اس لئے اسے زیادہ حصہ ملنا چاہیئے۔ جہاں ایسی صورت نہیں وہاں عورت کا حصہ مرد کے برابر رکھا گیا ہے۔ مثلاً ماں باپ میں سے ہر ایک کا حصہ (1/6) یا کلالہ کی صورت میں بہن اور بھائی میں سے ہر ایک کا حصہ (1/6)۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ قرآن مجید نے کلیہ کے طور پر عورت کا حصہ مرد سے نصف رکھا ہے۔

لیکن اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ مرد اپنے اس فریضہ کو نظر انداز کر رہے ہوں اور لڑکیوں کے متعلق اندیشہ ہو کہ وہ کس مپرسی کی حالت میں رہ جائیں گی تو قرآن نے متوفی کو پورا پورا حق دیا ہے کہ وہ اپنے ترکہ کی تقسیم اقتضائے حالات کے مطابق جس طرح جی چاہے (از روئے وصیت) کر جائے۔ قرآن کے مقرر کئے ہوئے حصے اس صورت میں عمل میں آتے ہیں جب متوفی بلا وصیت کئے مر جائے یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہ ہوتی ہو۔ قرآن میں اس کی صراحت موجود ہے۔ (آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ مروجہ قانونِ شریعت کی رو سے، وصیت کا قرآنی قانون منسوخ سمجھا جاتا ہے! یا للعجب)۔

(-)

عورتوں کی گواہی

دوسرا اعتراض ہے شہادت کے متعلق۔ سورۃ بقرہ میں آیت 2/282 میں ہے کہ جب تم آپس میں قرضہ کا معاملہ کرو تو اسے ضبطِ تحریر میں لے آؤ اور اس پر دو مرد بطور گواہ بلا لیا کرو۔ اس سے آگے ہے:....
فَإِنْ لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَأَتٰنِ ـ کہ اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتوں کو بطور گواہ بلا لیا کرو۔ دو عورتیں کیوں بلائی جائیں، اس کی علت قرآن نے یہ کہہ کر خود ہی

بیان کر دی ہے کہ یہ اس لئے ہے کہ

اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى ......

عام طور پر اس آیت کے یہ معنی کئے جاتے ہیں کہ دو عورتوں کی اس لئے ضرورت ہے کہ "ان میں سے اگر ایک بھول جائے تو دوسری اُسے یاد دلا دے"۔

ضلال کے بنیادی معنی ہیں، بات کا مبہم یا غیر واضح سا ہو جانا۔ ذہن میں اُلجھاؤ سا پیدا ہو جانا۔ واضح تر الفاظ میں (TO GET CONFUSED OR BECOME PERPLEXED)۔

اس لفظ کی وضاحت کے بعد اب اصل آیت کی طرف آئیے۔ اس آیت سے یہ سوال اٹھائے جاتے ہیں کہ

(i) ایک مرد کے بجائے دو عورتوں کو کیوں ضروری قرار دیا گیا۔ اور

(ii) یہ بات خصوصیت سے عورتوں کے متعلق کیوں کہی گئی کہ اگر ان میں سے ایک کو کچھ اُلجھاؤ سا پیدا ہو جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے، اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ قرآن کے نزدیک، عورتیں مردوں کے مقابلہ میں کم قابلِ اعتماد ہیں اور ان میں ذہنی صلاحیت بھی کم ہوتی ہے۔

جہاں تک قابلِ اعتماد ہونے کا تعلق ہے، قرآن نے شہادت میں مردوں کے لئے بھی دو کی شرط عائد کی ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائیگا کہ قرآن مردوں کو بھی قابلِ اعتماد نہیں سمجھتا۔ اسی لئے ایک کو کافی نہیں سمجھا گیا۔ ایک کے ساتھ دوسرے کی شہادت بھی ضروری قرار دی گئی ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ قرآن کا مقصود یہ نہیں کہ ایک مرد قابلِ اعتماد نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ایک کے بیان میں سہو یا سقم رہ جائے تو دوسرے کے بیان سے اس کی کمی پوری ہو جائے۔ یعنی اس سے ایک امکانی احتمال کی قانونی حد تک تمام مقصود ہے۔ مردوں کے متعلق یہ فتویٰ دینا مقصود نہیں کہ مرد قابلِ اعتماد نہیں ہوتے اس لئے ان میں سے کسی ایک (تنہا) کی شہادت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ یعنی مقصود شہادت کی توثیق (پختہ کرنا) ہے، نہ کہ مردوں کے ناقابلِ اعتماد ہونے کا اعلان۔

اسی طرح، جب قرآن نے ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کو ضروری قرار دیا ہے تو اس سے بھی یہ مقصود نہیں کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتیں کم قابلِ اعتماد ہوتی ہیں۔ اس لئے ایک مرد کی جگہ دو عورتیں ضروری ہیں۔ یہاں بھی مقصود ایسا طریقہ اختیار کرنا ہے جس سے شہادت زیادہ سے زیادہ یقینی ہو جائے۔ ورنہ جہاں تک مردوں اور عورتوں کے تقابلی (COMPARATIVE) اعتماد کا تعلق ہے، قرآن نے دونوں کو ایک ہی حیثیت دی ہے۔ مثلاً قرآن میں جہاں لعان کی شہادت کا ذکر ہے، وہاں ایک عورت کی شہادت کو بھی ایسا ہی قابلِ قبول قرار دیا ہے جیسا کہ ایک مرد کی شہادت کو۔ (ملاحظہ ہو ۲۴/۶-۹)۔

اب سوال دوسرا باقی رہ جاتا ہے کہ قرآن نے بالخصوص عورتوں کے متعلق کیوں کہا ہے کہ اگر ان میں سے ایک کو کچھ اشتباہ لاحق ہو جائے، کچھ گھبراہٹ سی ہو جائے تو دوسری عورت اسے یاد دلا دے۔

وہ تو زمانہ نزولِ قرآن کی بات ہے۔ آپ آج بیسویں صدی میں ہمارے ہاں کی مستورات میں سے کسی کو پہلے پہل عدالت میں لے جا کر گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیکھئے جہاں گرد و پیش اجنبی مرد ہوں۔

وہاں دیکھئے کہ اس بیچاری کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اس کے پسینے چھوٹ جائیں گے۔ وہ کانپنے لگ جائے گی۔ اس کی گھگھی بندھ جائے۔ اگر اس کے ساتھ اس کی کوئی جان پہچان والی عورت موجود ہو تو اس کا حوصلہ بندھ جائے گا۔ اسے کچھ کہنے کی ہمت ہو جائے گی۔ اس دوسری عورت کا ساتھ ہونا اس کے لئے باعثِ تقویت ہوگا۔ قرآن کریم نے ان عورتوں کے متعلق کہا ہے کہ

اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ (۴۳/۱۸)

یہ، زیورات میں پلی ہوئی جھگڑے کے وقت اپنے ما فی ضمیر کو بھی واضح طور پر بیان نہیں کر سکتی۔

اس قسم کی ہیں وہ عورتیں جن کے متعلق کہا ہے کہ انہیں عدالت میں جانا پڑے تو ان کے ساتھ (ان کی جان پہچان والی) ایک عورت کھڑی کر دو تاکہ اس کا حوصلہ بندھ جائے۔

ان تصریحات کے علاوہ یہ حقیقت بھی قابلِ غور ہے کہ قرآن کریم نے یہ کہیں نہیں کہا کہ ایک عورت کی شہادت کے بعد دوسری عورت کی شہادت لی جائے، اور اس طرح دو شہادات ایک مرد کی شہادت کے برابر ہو جائیں۔ اس نے کہا ہے کہ اگر گواہی دینے والی عورت کہیں (CONFUSED) ہو جائے تو اس کے ساتھ کھڑی سہیلی اسے یاد دلا دے کہ صحیح بات کیا تھی۔ (وہ عدالت سے کچھ نہیں کہے گی۔ گواہی دینے والی اپنی بہن کو صحیح بات یاد دلا دے گی) اس سے ظاہر ہے کہ اگر گواہی دینے والی عورت کو کوئی گھبراہٹ نہ ہو۔ وہ کہیں غلطی نہ کرے، تو ساتھ والی عورت کو مداخلت کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔

اور اس سے یہ بھی واضح ہے کہ لڑکیوں کی پرورش "زیورات" میں نہ کی جائے جس سے وہ معاملاتِ زندگی میں حصہ لینے کے قابل ہی نہ بن سکیں اور یوں غیر مبین (گونگی) بن کر رہ جائیں۔ بلکہ انہیں زیورِ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا جائے۔ اس صورت میں وہ غیر مبین نہیں رہیں گی اور دوسری عورت کی مداخلت کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔

یہ ہے حقیقت ان اعتراضات کی جن کی رُو سے عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں ناقص العقل۔ ناقابلِ اعتماد اور مردوں سے پست درجہ پر قرار دیا جاتا ہے۔

(۰)

عورتوں کے حقوقِ ملکیت

پہلے کہا جا چکا ہے کہ تقسیمِ کار کی رُو سے، بیوی بچوں کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری مرد کے سر پر ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ عورت نہ کمائی کر سکتی ہے، اور نہ ہی اسے حقوقِ ملکیت حاصل ہوتے ہیں۔ وہ کمائی بھی کر سکتی ہے اور اسے ذاتی حقوقِ ملکیت بھی حاصل ہوتے ہیں۔ سورۃ النساء میں ہے:۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ (۴/۳۲)

ایک دوسرے کے حقوق کی حفاظت کے سلسلہ میں، اس غلط تصور کا ازالہ بھی ضروری ہے

جس کی رو سے سمجھا جاتا ہے کہ حقوقِ ملکیت مرد کو حاصل ہوتے ہیں، عورت کو نہیں ہوتے۔ عورت اپنے مال اور جائداد کی آپ مالک ہوتی ہے (دیکھئے)۔ اسی طرح یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ کمائی کرنا مردوں کا کام ہے، عورتیں ایسا نہیں کرسکتیں۔ مرد اور عورتیں، سب اکتسابِ رزق کرسکتے ہیں۔ جو کچھ مرد کمائے وہ اس کا حصہ ہے۔ جو عورت کمائے وہ اس کا حصہ۔ (یہ الگ بات ہے کہ گھر کی زندگی میں میاں بیوی باہمی تعاون سے کام لیتے ہیں) یہ ٹھیک ہے کہ جہاں تک فطری فرائض کا تعلق ہے بعض باتوں میں مردوں کو برتری حاصل ہے اور بعض میں عورتوں کو لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورتیں اپنے آپ کو اپاہج بنا کر، مردوں کی کمائی کو تکتی رہیں۔ (نہ خود کچھ کریں) انہیں چاہیئے کہ خدا سے زیادہ سے زیادہ اکتساب کی توفیق طلب کرتی رہیں۔ خدا خوب جانتا ہے کہ وہ کیا کچھ کرسکتی ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ عورت کو جو کچھ ترکہ میں ملے، وہ اس کی ملکیت ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنی کمائی کی بھی آپ مالک ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ گھر کا ماحول خوشگوار اور ازدواجی زندگی کامیاب ہو، تو میاں بیوی کے تعلقات "کاروباری" نہیں رہتے۔ باہمی رفاقت اور تعاون کے ہو جاتے ہیں۔ لیکن ملکیت کی قانونی حیثیت وہی ہے جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ غور کیجئے کہ زندگی کا کوئی گوشہ بھی ایسا ہے جس میں قرآن نے عورتوں کو مردوں سے (یا بیوی کو مرد سے) پست درجہ پر رکھا ہو؟ ہمارے ہاں عورت کے متعلق جو خیالات رائج ہیں (اور جنہیں بدقسمتی سے قوانینِ شریعت کہہ کر پکارا جاتا ہے) وہ یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں سے مستعار لئے گئے ہیں۔ قرآن کا دامن ان سے پاک اور صاف ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت کا، عورت سے ضد، نفرت، تعصب کا یہ عالم ہے کہ زندگی میں تو ایک طرف، اس بے چاری کی موت کے بعد بھی یہ نفرت قائم رہتی ہے۔ ان کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر عورت کو قتل کر دیا جائے تو اس کا خون بہا مرد کے خون بہا سے نصف ہوگا۔ عورت کی جان کی قیمت بھی مرد کی جان کی قیمت سے نصف ہے۔ جن کے تعصب کا یہ عالم ہو ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ عورت اور مرد کو ہم دوش تسلیم کرلیں گے، عبث ہے۔ یہ تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ مملکت کا قانون، قرآنی ہو۔

پردہ

اب ہم زیرِ نظر موضوع کے اس گوشے کی طرف آتے ہیں جسے سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، اور چونکہ اس کا تعلق جذبات سے ہے اس لئے وہ نازک بھی بہت ہے۔ ہمارے اربابِ شریعت کا اصرار ہے کہ عورتوں کو گھر کی چار دیواری کے اندر بند رہنا چاہیئے۔ اور اگر انہیں (مصیبت کے مارے کہیں) گھر سے نکلنا پڑے تو وہ چلتا پھرتا خیمہ (WALKING TENT) نظر آئے۔ عورتوں کو اس حیثیت میں رکھنے کے لئے انہیں کسی اتھارٹی کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ کیا تھا کہ انہوں نے "اپنے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کو خدا سے ورے ہی خدا بنا رکھا ہے"۔ یہی صورت ہمارے ہاں متوارث چلی آرہی ہے۔ ان کا ہر ارشاد فرمانِ خداوندی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود رسول اللہؐ سے بھی کہہ دیا تھا کہ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ...... (۶۶/۱) "جسے اللہ نے تمہارے لئے حلال قرار دیا ہے اسے حرام مت ٹھہراؤ"۔ لیکن احبار و رہبان کو اس کا لائسنس حاصل ہے کہ وہ خدا کے جس حلال کو چاہیں حرام قرار دے دیں۔ جس حرام کو چاہیں حلال ٹھہرا دیں۔ اس باب میں عورت بیچاری ان کا سب سے پہلا اور بڑا ہدف ہے۔ اور اس کی ہر (خداداد) آزادی کو پابندیوں کی

زنجیروں میں جکڑ دینا؛ ان کا قابلِ فخر کارنامہ۔ پردہ اس کی شدید ترین شکل ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں حصہ لینے کو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے لئے ممنوع قرار دیا ہو۔ لیکن ان حضرات نے ان پر زندگی کے تمام دروازے بند کر رکھے ہیں۔

پردہ سے متعلق قرآنی تعلیم کے سمجھنے سے پہلے، یہ دیکھنا ضروری ہے کہ زمانۂ نزولِ قرآن میں رسول اللہ کی اولیں مخاطب قوم کی تمدنی اور معاشرتی سطح کیا تھی؟ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انہیں یہ بھی سمجھانا پڑتا تھا کہ چیخ چیخ کر بولنا اچھی عادت نہیں (۳۱/۱۹)۔ اکڑ کر چلنا معیوب ہے (۱۷/۳۷)۔ مجلس میں کھل کر بیٹھنا چاہیئے اور جب مجلس برخاست ہو تو اٹھ کر چلے جانا چاہیئے (۵۸/۱۱)۔ دوسروں کے ہاں جانا ہو تو اجازت لے کر جاؤ (۲۴/۲۷)۔ دوسروں کے ہاں سے کوئی چیز لینی ہو تو دروازہ سے باہر آواز دے کر مانگنی چاہیئے (۳۳/۵۳)۔ جب رسول اللہ تمہیں کھانے کے لئے دعوت دیں تو ایسا نہ کرو کہ ابھی ہانڈیاں چولہے پر دھری ہوں اور تم کھانے کے لئے جا بیٹھو۔ نہ ہی ایسا کرو کہ کھانے کے بعد وہیں بیٹھے باتیں کرنے لگ جاؤ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اس سے صاحب خانہ کو کس قدر تکلیف ہوتی ہے (۳۳/۵۳)۔ اس قوم کو اس قسم کے عام آدابِ معاشرت بھی وحی کے ذریعے سمجھانے اور سکھانے پڑتے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی تمدنی سطح (بالعموم) کیا تھی اور انہیں مہذب سوسائٹی کی سطح پر لانے کے لئے کس قدر تدریجی تعلیم و تربیت کی ضرورت تھی۔ عورتوں کے ساتھ اختلاط و ارتباط کا سوال اس میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ جہالت کا علاج تو مناسب تعلیم و تربیت سے کیا جاسکتا تھا۔ لیکن (مدینہ میں) منافقین کی بھی خاصی تعداد تھی جن کا شیوہ ہی شرانگیزی تھا۔ عورتوں کے معاملہ میں شرانگیزی جس قدر آسان ہوتی ہے اسی قدر مہلک بھی۔ سورۂ احزاب میں، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ سے فرمایا کہ "اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مومنین کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ باہر نکلا کریں تو اپنے کپڑوں کے اوپر جلباب (OVER - ALL) پہن لیا کریں"۔ اس حکم کی ضرورت کیوں پیش آئی؛ اس کی وضاحت بھی وہاں کر دی۔ یہ مستورات باہر نکلتیں تو منافقین ان سے چھیڑ خانی کرتے۔ جب ان سے کہا جاتا تو وہ جواب میں کہتے کہ ہمیں پتہ نہیں چلتا کہ یہ شریف زادیاں ہیں یا بازاری عورتیں۔ ان کی اس حجت کو پورا کرنے کیلئے مومن مستورات سے کہا گیا کہ تم جلباب پہن کر باہر نکلا کرو۔ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ (۳۳/۵۹)۔ اس سے تم پہچانی جاؤ گی کہ تم شریف عورتیں ہو، اور یہ لوگ تمہیں ستائیں گے نہیں۔ اس سے اگلی آیت میں ہے کہ اگر تمہاری اس احتیاطی تدبیر کے بعد بھی یہ لوگ اپنی حرکات سے باز نہ آئیں تو پھر ان سے مجرموں جیسا برتاؤ کرو۔ (۳۳/۶۰)۔

اس ایک واقعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم میں عورتوں کے گھروں میں رہنے اور باہر نکلتے وقت خاص احتیاط برتنے کی تلقین اور تاکید، اس معاشرہ کے خصوصی حالات کا تقاضا تھی۔ یہ ابدی اور غیر متبدل احکام نہیں تھے۔ اصل چیز قرآنی تعلیم کی روح اور بنیاد ہے۔ وہ ہمیشہ غیر متبدل رہے گی اور اس پر عمل پیرا ہونے کے ذرائع حالات کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ جس طرح (مثلاً) جنگ کی ضرورت کی روح اور اصول تو ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ جنگ لڑنے کے طور طریق اور ذرائع و آلات زمانے کے ساتھ بدلتے رہنے والے۔

اس بنیادی حقیقت کی روشنی میں پردہ کے متعلق قرآنی احکام و تعلیمات آسانی سے سمجھ میں آجائیں گی۔

تحفظ عصمت

جنسیات کے متعلق قرآنی تعلیم کی روح۔ اس کا اصل الاصول تحفظ عصمت ہے جو قرآن کی متعین کردہ مستقل قدر ہے

وہ اس کا تقاضا مردوں اور عورتوں دونوں سے کرتا ہے۔ بلکہ مردوں کا نام پہلے لیتا ہے یَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ۔ (۲۴/۳۰) اور عورتوں کا بعد میں وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ (۲۴/۳۱)۔ وہ مومن مردوں اور عورتوں کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ اَلْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ۔ (۳۳/۳۵) "اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والے مرد اور ایسا کرنے والی عورتیں"۔ لیکن ہمارے ہاں تحفظِ عصمت کا مطالبہ عورتوں سے کیا جاتا ہے، مردوں سے نہیں۔ حتیٰ کہ عصمت کا لفظ بھی عورتوں سے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔ باعصمت یا اس کے برعکس، عصمت فروش، عورت ہوتی ہے، مرد نہیں۔ عورتوں کے تحفظِ عصمت کے لئے تو آئے دن ہنگامے بپا رہتے ہیں لیکن مردوں سے تحفظ عصمت کے مطالبہ کے لئے کوئی تحریک نہیں چلائی جاتی۔ مذہبی حلقہ کی طرف سے یہ پراپیگنڈہ بھی عام

بداخلاقی پھیلانے کا ذمہ دار کون ہوتا ہے؟

کیا جاتا ہے کہ معاشرہ میں بداخلاقی پھیلانے کی ذمہ دار عورتیں ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر مرد، بدکرداری کے لئے عورتوں کی طرف رجوع نہ کریں، تو عورتوں کے لئے ممکن ہی نہیں کہ وہ بدکاری کی مرتکب ہوں۔ اگر کوئی بدنیت عورت، مردوں کے لئے بدکاری کی کشش بھی پیدا کرے، تو اگر مرد مستقل مزاج ہوں تو ان کی کشش و دعوت کبھی بدکرداری نہیں پھیلا سکتی۔ بدکرداری کا عملی ارتکاب مردوں کی طرف سے ہوتا ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ مرد اس حقیقت کو تسلیم کریں، ہر محراب و منبر سے یہ آواز بلند ہوتی رہتی ہے کہ بداخلاقی عورتیں پھیلاتی ہیں۔

مردوں کا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے۔

عورتوں کو گھروں کے اندر بند کر دینے کے جواز میں یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ ان کے باہر نکلنے سے مردوں کا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے۔ ہم جب بھی اس دلیل کو سنتے ہیں، شرم کے مارے زمین میں گڑ جاتے ہیں کہ مردوں کا ایمان اس قدر کمزور ہوتا ہے کہ عورت کو دیکھنے سے متزلزل ہو جاتا ہے۔ تف ہے ایسے ایمان پر جو اس قدر کمزور ہو! ایسے کمزور ایمان کو ایمان کہنا، لفظ ایمان کی تذلیل ہے۔ اگلے دنوں ایک معزز خاتون کو کہتے سنا گیا کہ اس سے پہلے ہمارے ذمے جو فرائض عائد کئے جاتے تھے، ان میں اب ایک اور کا اضافہ ہو گیا ہے وہ یہ کہ مردوں کے ایمان کو قائم رکھنا بھی ہمارے فرائض میں داخل ہے۔ ہمیں گھروں میں بند رہنا چاہیئے تاکہ مردوں کا ایمان نہ بگڑے! قرآن کریم نے اس کے لئے بطور حفظ ماتقدم یہ تدبیر بتائی کہ جب یہ باہر نکلیں تو اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں۔ اور یہ سنکر آپ متعجب ہونگے کہ اس نے پہلے یہ تلقین مردوں کو کی ہے۔ (قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ۔ (۲۴/۳۰)، اور بعد میں عورتوں سے۔ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ (۲۴/۳۱)۔ لیکن مردوں کو اس کی توفیق کہاں کہ وہ اپنے آپ پر اتنا ضبط کر سکیں۔ کچھ سال اُدھر کی بات ہے پرویز صاحب کے درس قرآن میں مستند کے ایک راہبے، مولوی صاحب تشریف لے آئے۔ درس میں حسب معمول، ایک طرف پوری پوری ممکنت اور متانت سے بہنیں، کچھ خواتین بیٹھی تھیں۔ مولوی صاحب نے کچھ وقت کے لئے تو ضبط کیا لیکن پھر کھڑے ہو کر باآواز بلند کہا کہ ان "بیبیوں کو پردے کے پیچھے بٹھاؤ۔ ہمارا ایمان خراب ہو رہا ہے۔ ان سے کہا گیا کہ آپ ان کی طرف نہ دیکھیں۔ کہا کہ ایسا کرنا مشکل ہے۔ سامعین نے اصرار کیا کہ وہ کمرے کے اندر تشریف لے جائیں۔ وہ طوعاً و کرہاً اندر چلے تو گئے لیکن چند ہی منٹوں کے بعد بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل آئے کہ ان بیبیوں نے ہماری جان عذاب میں ڈال رکھی ہے انہیں اندر بٹھانا چاہیئے"۔ مردوں کو ایمان بڑا عزیز ہے۔ اور اس کے قائم رہنے کا ایک ہی طریق ہے کہ عورتیں گھروں کے اندر بند رہیں۔

نظربندی

عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں بند کر دینا ایک سزا ہے جسے قرآن ان عورتوں کے لئے تجویز کرتا ہے جن سے کچھ بے حیائی کے آثار مترشح ہو رہے ہوں یعنی وہ زنا کی مرتکب تو نہ ہوئی ہوں لیکن ان سے ایسی حرکات نمودار ہوں جو ناجائز جنسی تعلقات کی طرف لے جانے والی ہوں۔ ارشاد خداوندی ہے۔

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْہِدُوْا عَلَیْہِنَّ اَرْبَعَۃً مِّنْکُمْ فَاِنْ شَہِدُوْا فَاَمْسِکُوْہُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰہُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لَہُنَّ سَبِیْلًا ○ (4/15)

اگر تمہاری عورتوں میں سے کسی سے ایسی بے حیائی کی حرکات سرزد ہوں (جو زنا کی طرف لے جانے کا موجب بن سکتی ہوں) تو ان کے خلاف اپنوں میں سے چار گواہ لاؤ۔ (اگر اس طرح جرم ثابت ہو جائے تو) انہیں گھروں سے باہر آنے سے روک دو تاآنکہ انہیں موت آ جائے یا خدا کا قانون ایسی صورت پیدا کر دے جس سے وہ اس قسم کی حرکات سے رک جائیں۔

اس وقت اس آیت کے دیگر مضمرات سے بحث مقصود نہیں۔ ہم بتانا صرف یہ چاہتے ہیں کہ عورتوں کو گھروں میں بند کر دینا قرآن کریم کی رو سے جرم فحاشی کی سزا ہے۔

ہم نے زمانہ قبل از اسلام (عہد جاہلیہ) کے عربوں کی تمدنی اور معاشرتی سطح کے متعلق جو کچھ پہلے لکھا ہے اسے ایک بار پھر سامنے لایئے جس سے یہ حقیقت بار دگر واضح ہو جائے گی کہ ان کے عادات و اطوار کس قسم کے تھے۔ عہد رسالتمآبؐ کے مسلمان مرد اور عورتیں بھی اسی فضا کے پروردہ تھے۔ قرآن کے پیش نظر ان کی (دل کی گہرائیوں، بلکہ تحت الشعور تک میں جاگزیں) عادات و اطوار کی ایسی اصلاح تھی کہ وہ رفتہ رفتہ قرآنی قالب میں ڈھل جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے بعض اوقات ایسی پابندیاں عائد کرنے کی بھی ضرورت تھی جو عام حالات میں قدرے سخت نظر آئیں۔ اس پس منظر میں قرآن کے اصلاحی اقدامات کا جائزہ لینا چاہیئے۔ سورۃ النور اور سورۃ الاحزاب میں اسی قسم کی اصلاحی تدابیر کا ذکر ہے۔ اس اصلاحی پروگرام کا آغاز خود حضورؐ کی اہل خانہ خواتین (نساء النبیؐ) سے کیا کیونکہ ان کی زندگی کو دوسری عورتوں کے لئے ماڈل بننا تھا۔ اسی لئے ان سے کہا گیا کہ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (33/32) تم عام عورتوں جیسی نہیں ہو۔ ان سے کہا کہ وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ (33/33)۔ تم نہایت سنجیدگی اور وقار سے اپنے گھروں میں رہو۔ تم سے کوئی چھچھورے پن کی بات سرزد نہ ہونے پائے۔ اس کے بعد ہے وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاہِلِیَّۃِ الْاُوْلٰی (33/33)۔ تبرج کا مفہوم ذرا آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ یہاں یہ دیکھئے کہ ہم نے جو کہا تھا کہ قرآن کے پیش نظر ان مردوں اور عورتوں کے زمانہ جاہلیہ کے اطوار و کردار کی اصلاح تھی اس کی تائید آیت کے ان الفاظ سے ہو رہی ہے۔ یعنی ان سے کہا گیا کہ وہ زمانہ جاہلیت کا سا تبرج جاہلانہ انداز اختیار نہ کریں۔

انہیں گھروں میں با وقار طور پر رہنے کا سلیقہ سکھایا گیا۔ پھر کہا کہ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِہٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (33/32)۔ اگر تمہیں کسی غیر محرم سے بات کرنی ہو تو اپنی آواز میں ایسی نرمی اور لوچ نہ پیدا

ہونے دو کہ اس سے ایسے شخص کے دل میں جو برے خیالات لئے ہو، غلط قسم کی آرزوئیں بیدار ہو جائیں ۔ اس سے قاعدے کے مطابق عمدہ طریق سے بات کرو۔

اس آیت میں یہ نکتہ خاص طور پر قابل غور ہے کہ نساء النبیؐ سے کہا جا رہا ہے کہ تم بات بھی اس انداز سے کرو کہ اس سے ایسے شخص کے دل میں جو برے خیالات لئے ہو، غلط آرزوئیں نہ بیدار ہو جائیں ۔ اس سے ظاہر ہے کہ عہد جاہلیہ کے افراد معاشرہ کے قلب و نظر میں کس قسم کی آلودگیاں پیدا ہو چکی تھیں اور ان کی اصلاح کے لئے کس انداز کی تدابیر کی ضرورت تھی۔

*

زیب و زینت

قرآن کریم ازیب و زینت (تحسین حسن[1]) کو کس قدر اہمیت دیتا ہے ، اس کی وضاحت کا یہ مقام نہیں ۔ اس کے لئے (کم از کم) پرویز صاحب کا وہ مقالہ دیکھ لینا چاہیئے جو آرٹ اور اسلام کے عنوان سے طلوع اسلام بابت جولائی ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا تھا اس مقام پر صرف اتنا بتا دینا کافی ہو گا کہ قرآن کریم نے زینت و آرائش کے متعلق کیا کہا ہے ۔ سورہ اعراف میں ہے:۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۔۔۔۔۔۔۔۔

(۷/۳۲)

اے رسولؐ ! ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان اشیاء کو جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کیلئے بنایا ہے اور خوشگوار سامان رزق کو حرام قرار دے؟

آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے آرائش و زیبائش کو ممنوع قرار دینے والوں کو کس تحدی سے چیلنج کیا ہے ؟ لہٰذا عورتوں (اور مردوں) کے لئے زیب و زینت کو کوئی ناجائز نہیں قرار دے سکتا۔

لیکن زیب و زینت کو اپنے جذبہ تحسین حسن (AESTHETIC SENSE) کی تسکین کا ذریعہ قرار دینے اور اس کی نمود و نمائش کرنے میں بڑا فرق ہے ۔ عہد جاہلیہ میں اسے نمود حسن کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا ۔ قرآن نے اس جذبہ کی اصلاح کی ۔ اس کے لئے اس نے جو لفظ استعمال کیا ہے ، وہ بڑا جامع ہے ۔ اس نے کہا ہے کہ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى (۳۳/۳۳) تم زیب و زینت کو عہد جاہلیہ کے جذبہ تبرّج کی تسکین کا ذریعہ نہ بناؤ۔

تبرّج کا مادہ (ب ۔ ر ۔ ج) ہے جس کے بنیادی معنی ابھارنے کے ہیں ۔ (لفظ برج سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی) ۔ اسی کو نمود اور نمائش کہتے ہیں ۔ لیکن اس کا نفسیاتی مفہوم اس سے گہرا ہے ۔ البرّیج اس بلوئی یا مشک کو کہتے ہیں جس میں دودھ بلویا جاتا ہے ۔ دودھ بلونے سے اس میں جس قدر تحرک اور تلاطم پیدا ہوتا ہے ، ظاہر ہے ۔ لہٰذا تبرّج اس قسم کے نمود حسن اور نمائش زینت کو کہیں گے جس سے ان مردوں کے سینے میں ، جن کا قلب و نگاہ آلودہ ہو ، جذبات کا

---

[1] فطرت کی ہر شے کا حسن۔

تلاطم برپا ہو جائے۔ عہدِ جاہلیہ میں نمود حسن و آرائش سے یہی مقصود تھا۔ قرآن نے اسی سے منع کیا ہے۔ یعنی بالارادہ نمود حسن و زینت اسی لئے کہا کہ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (۲۴/۳۱)۔ وہ اپنی زینت کو بالارادہ نمایاں نہ کریں۔ جو از خود ظاہر ہو جائے اس کا مضائقہ نہیں۔

ہم نے پہلے دیکھا ہے کہ قرآن نے کن حالات کے تحت عورتوں کو جلباب کے پہننے کی تلقین کی تھی۔ یہاں کہا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ (۲۴/۳۱)۔ انہیں چاہیئے کہ اپنے اوڑھنے کی چادریں اپنے سینہ پر ڈال لیا کریں۔ اس باب میں اس حد تک احتیاط ملحوظ رکھی گئی کہ کہا کہ وہ چلیں تو اس انداز سے کہ پوشیدہ زینت (پاؤں کے زیور وغیرہ) کی جھنکار بھی سنائی نہ دے۔ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ (۲۴/۳۱)

لیکن ان تاکیدات سے مقصد زیب و زینت کی مخالفت نہیں۔ ان احکامات کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ

یہ عورتیں اپنی زینت کو نمایاں نہ ہونے دیں۔ بجز اپنے خاوندوں۔ اپنے باپ۔ خسر۔ اپنے بیٹے یا خاوند کے بیٹے (یعنی حقیقی یا سوتیلے بیٹے)۔ بھائی۔ بھتیجے۔ بھانجے۔ اپنی (جانی پہچانی) عورتوں۔ یا ان غلام اور لونڈیوں کے (جو اس زمانے میں عربوں کے ہاں کام کاج کیا کرتے تھے)۔ یا دیگر خدمتگاروں میں سے ایسے سن رسیدہ جو جنسی خواہشات سے گزر چکے ہوں۔ یا ایسے بچوں کے جو عورتوں کی پردے کی باتوں (جنسیات) سے ناآشنا ہوں۔ یعنی ان کے سامنے نمودِ زینت میں کوئی مضائقہ نہیں (۲۴/۳۱)۔

اظہار و نمودِ زینت کے علاوہ اس نے پرائیویسی کا بھی ایسا خیال رکھا ہے کہ بچوں اور ملازموں کے متعلق بھی کہہ دیا کہ وہ صبح تمہارے اٹھنے (صلوٰۃ الفجر) سے پہلے۔ دوپہر کے وقت جب تم آرام کر رہے ہو۔ اور رات کے وقت (صلوٰۃ العشاء کے بعد) تمہارے کمرے میں آنا چاہیں تو اجازت لے کر آیا کریں۔ (۲۴/۵۸)

یہ ہیں پردے اور سترِ زینت کے متعلق قرآنی احکام و ہدایات۔ ان کی تدبر سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان سے مقصود ان خیالات کی تطہیر اور ان عادات و اطوار کی اصلاح تھی جو زمانہ قبل از اسلام (دورِ جاہلیہ) کی زندگی کا عام شعار تھے اور جو قرآن کے

تطہیرِ قلب و نگاہ

معاشرتی نظام میں فٹ نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ چنانچہ ان احکام کا مقصد یہ بتایا۔ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ۝ (۳۳/۳۳) "خدا چاہتا یہ ہے کہ تم سے قلب و نظر کی آلودگی کو دور کر کے تمہاری سیرت کو پاکیزہ بنا دے۔" جنسیات کے سلسلہ میں دین کی بنیادی غایت تحفظِ عصمت ہے۔ اور یہ تمام احکام اسی (عصمت) کے پاسبان ہیں۔ اسلامی حکومت (مسلمانوں کی حکومت نہیں بلکہ اسلامی حکومت) کا فریضہ ہو گا کہ وہ اپنے زمانے کے حالات کا جائزہ لے اور پھر دیکھے کہ اس مقصد کے حصول کیلئے کیا تدابیر اختیار کرنا ضروری ہیں۔ یاد رہے کہ جنسیات کی تطہیر نہ تو ڈنڈے کے زور سے ہو سکتی ہے اور نہ ہی قوانین کو میکانکی طور پر نافذ کرنے سے۔ یہ گہر نفسیاتی تقاضا ہے جسے دل سے ابھرنے والے خیالات کی تطہیر ہی سے کنٹرول میں رکھا جا سکتا ہے۔ (یہ الگ موضوع ہے جس کے متعلق ہم وقتاً فوقتاً لکھتے چلے آ رہے ہیں)۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ (۴۰/۱۹)۔ "خدا نگاہوں کی خیانتوں اور دلوں میں پوشیدہ رازوں سے بھی واقف ہے۔" خیالات سے اس تقاضا کا کس قدر گہرا تعلق ہوتا ہے اس کا اندازہ ایک پیش پا افتادہ مثال سے لگائیے۔ ایک آوارہ گرد نوجوان جو دن بھر

کسی تازہ شکار کی تلاش میں پھرتا رہتا ہے، رات کو اپنے گھر میں ایسے کمرہ میں سوتا ہے جس میں اس کی نوجوان بہن بھی ہوتی ہے۔ اس کمرے میں ہی نہیں۔ گھر بھر میں کوئی تیسرا متنفس نہیں ہوتا۔ وہ اس تنہائی میں اپنی ہمشیرہ کے ساتھ والے پلنگ پر سوتا ہے اور دست درازی تو ایک طرف بہن کی طرف کبھی غلط انداز سے بھی نہیں دیکھتا۔ ایسا کیوں ہے؟ وہ اس جوان لڑکی کی طرف بدنگہی سے کیوں نہیں دیکھتا؟ اس لئے کہ اس کے دل میں یہ خیال راسخ ہے کہ بہن کے خلاف آلودہ نگہی سخت معیوب ہے۔[1]

قرآن اپنی عدیم النظیر تعلیم و تربیت سے اپنے نوجوانوں لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے قلب و نگاہ میں ایسی پاکیزگی پیدا کرتا ہے کہ ہر نوجوان لڑکا (اپنی بیوی کے سوا) ہر لڑکی اور عورت کو بہن سمجھتا ہے۔ قرآن کریم نے جب کہا ہے کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (۴۹/۱۰) تو اس کے معنی یہی نہیں کہ مومن مرد آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ مومن عورتیں مومن مردوں کی بہنیں ہیں۔ (قرآن کریم نے یہ لفظ بھائی اور بہن دونوں کے لئے استعمال کیا ہے) (۴/۱۷۶)۔ لہٰذا اگر مناسب تعلیم و تربیت سے قلب و نظر کی تطہیر ہو جائے تو یہ سارے مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ اور اگر یہ نہ ہو تو دنیا کی کوئی طاقت یا کوئی قانون یا کوئی تدبیر اس کا حل پیش نہیں کر سکتی۔ اگر ایسی تطہیر نہ ہو، اور جنسی جذبات بیباک ہوں تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

پری رُو تاب مستوری ندارند   چو در بندی ز روزن سر برآرند

حرفِ آخر

ہم نے شروع میں کہا تھا کہ وہ بنیادی اصول جس پر یہ تمام عمارت استوار ہوتی ہے، آخر میں بیان کی جائے گی۔ اور وہ بنیادی اصول یہ ہے کہ قرآن، پیدائش کی رو سے انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کرتا۔

یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ جو شخص بنی اسرائیل کے گھرانے میں پیدا ہو، وہی جنت میں جا سکے گا۔ غیر بنی اسرائیل جنت میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔ یہ پیدائش کی رو سے انسان اور انسان میں بڑی بنیادی تفریق تھی۔ کسی انسان کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ بنی اسرائیل کے گھرانے میں پیدا ہو، یا غیر بنی اسرائیل کے گھرانے میں۔ غیر بنی اسرائیل کو ایک ایسے جرم کی سزا دینا جو اس کے بس کی بات ہی نہیں، خدا کے شایانِ شان نہیں۔

عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنے اولیں ماں باپ کے گناہ کا بوجھ لادے دنیا میں آتا ہے اور تاوقتیکہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے کفارہ پر ایمان نہ لائے، وہ جنت کا مستحق قرار نہیں پا سکتا۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی بچہ اپنے اختیار و ارادہ سے دنیا میں نہیں آتا۔ اس لئے انہیں اس بات کی سزا دینا کہ وہ انسانوں کے گھر کیوں پیدا ہوئے ہیں، اصول عدل کے یکسر خلاف ہے۔

ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ تمام انسان پیدائش کی رو سے چار ورنوں (ذاتوں) میں تقسیم ہوتے ہیں۔ برہمن (برہما کے

---

[1] (SEX PERVERTION) کی بات الگ ہے۔ وہ انتہائی شدید نفسیاتی مرض کی علامت ہوتی ہے جس کا تعلق مستثنیات (EXCEPTIONS) سے ہوتا ہے۔ ہم اوپر کی مثال میں معمولات سے بحث کر رہے ہیں۔

سر سے پیدا ہوتے ہیں) اس لئے ہر قسم کی عزت و تکریم، بلکہ تقدیس کے مستحق ہیں۔

کھشتری (برہما کے بازوؤں سے پیدا ہونے کی وجہ سے) تخت و تاج کے وارث ہوتے ہیں۔

ویش (برہما کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں اس لئے) وہ کاروبار (بیوپار وغیرہ) کا کام کرینگے۔ اور

شودر (برہما کے پاؤں سے پیدا ہوتے ہیں اس لئے) ان کا فریضہ باقی ورنوں (بالخصوص برہمنوں) کی خدمتگذاری ہے۔

انہیں درجۂ انسانیت حاصل ہی نہیں۔

اس تقسیم و تفریق کو بدلنے کا کسی کو حق حاصل نہیں ——— آپ غور کیجئے کہ اس تفریق و تقسیم کو برہما (خدا) کی طرف منسوب کرنے سے خدا کا کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے؟

قرآن آیا اور اس نے ایک کلمہ (ابدی اصول) باطل کے ان تمام عقائد پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا۔ اس نے کہا

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17/70)

ہم نے تمام انسانوں کو یکساں واجب التکریم پیدا کیا ہے۔

اس لئے پیدائش کے اعتبار سے کسی انسانی بچے میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ خدا نے جس تعظیم و تکریم کا حامل "انسان" کو ٹھہرایا ہے۔ اس میں تمام انسان شامل ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ "انسان" میں مرد اور عورتیں، دونوں شامل ہیں۔ اس لئے قرآن نے جو کچھ انسان ریا ناس) کے متعلق کہا ہے اس کا اطلاق مردوں اور عورتوں دونوں پر ہوتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ نہ کوئی لڑکا اپنے اختیار و ارادہ سے لڑکا پیدا ہوتا ہے، نہ کوئی لڑکی اپنے انتخاب (CHOICE) سے لڑکی۔ اب، لڑکی (یعنی عورت) کو لڑکے (یعنی مرد) سے کسی اعتبار سے بھی پست (INFERIOR) سمجھنا، پیدائشی تفریق کے اسی باطل عقیدہ کی طرف لوٹ جانے کے مرادف ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ بنابریں، مردوں کو عورتوں سے افضل سمجھنا قرآن کے اصل الاصول کے خلاف اور منشاء خداوندی کے منافی ہے۔ قرآن کی رُو سے، افضلیت، جوہرِ ذاتی (حسن سیرت و کردار اور اعمال) کی رو سے حاصل ہوتی ہے، نہ کہ پیدائش کی رُو سے۔ اور اس اصل الاصول میں مرد اور عورتیں دونوں برابر کے شریک ہیں۔ یہ تمام خیالات و عقائد جن کی رُو سے عورت کو مرد کے مقابلہ میں جنس کاسد سمجھا جاتا ہے، اس "اسلام" کے پیدا کردہ ہیں جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا، جس میں عورتیں منڈیوں میں نیلام ہوا کرتی تھیں۔ ہماری فقہ کی کتابیں، عورتوں کی خرید و فروخت سے متعلق "مسائل" سے بھری پڑی ہیں۔

قرآن کریم نے نمود و زینت کو جو مستحسن قرار نہیں دیا، تو اس میں بھی عورتوں کے شرف و مجد کا راز پوشیدہ ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عیسائیت اور یہودیت میں عورت کی تخلیق (یعنی آدم کی پسلی سے پیدا ہونے) کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ آدم (مرد) کے بہلاوے کا ذریعہ بن سکے۔ یعنی ان کے نزدیک عورت کا وجود مقصود بالذات نہیں۔ آدم (مرد) کے ایک تقاضا کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اسے مرد کے کھلونے کے طور پر پیدا کیا گیا ہے۔

قرآن کریم نے اس باطل تصور کو بھی مٹایا اور کہا کہ مرد اور عورت دونوں کی تخلیق مقصود بالذات ہے ——— نہ مرد، عورت کے کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے، نہ عورت، مرد کے کسی مقصد کے پورا کرنے کا ذریعہ۔ یہ دونوں خدا کے پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے کے یکساں ذرائع ہیں۔

عورت کا مقام بلند

قرآن نے تو یہ بتایا۔ لیکن ہمارے ہاں کی عورت کے دل میں اس خیال کو کوٹ کوٹ کر بھرا گیا کہ اس کی تخلیق مقصود بالذات نہیں، بلکہ مردوں کے ایک تقاضا کے پورا کرنے کا ذریعہ ہے اس سے غیر شعوری طور پر یہ خیال عورت کے تحت الشعور میں جاگزیں ہو گیا کہ اس کا مقصدِ حیات مردوں کا کھلونا بننا ہے۔ عورت کی طرف سے غیر مردوں کے سامنے حسن و زینت کی نمود کا جذبہ، غیر شعوری طور پر اس تقاضا کا پیدا کردہ ہے کہ وہ ان کی نگاہوں میں پرکشش بن جائے۔ آپ نے اس پر بھی غور فرمایا کہ قرآن کریم نے جو باپ، بھائی، بیٹے وغیرہ کے سامنے نمود زینت کو معیوب قرار نہیں دیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سامنے نمودِ حسن کا جذبہ پرکشش بننا نہیں ہوتا۔ آپ غور قرآن کی ان باریکیوں کو بنگاہِ تعمق دیکھیے کہ اس نے نمودِ حسن و نمائشِ زینت کے خلاف احکامات کے ملحق دوسری آیت میں، عورتوں سے کہا ہے کہ تم تو زندگی کے کسی گوشے میں بھی مردوں سے پیچھے نہیں ہو، اس لئے تمہارے دل میں مردوں کا کھلونا بننے کا جذبہ کیوں کارفرما ہے؟ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے۔ اس نے کہا کہ

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا۔ (۳۳/۳۵)

یاد رکھو ہم نے مردوں اور عورتوں، دونوں میں اس امر کی استعداد رکھ دی ہے کہ وہ

۱۔ قوانین خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہوں۔

۲۔ ان قوانین کی محض میکانکی طور پر اطاعت نہ کریں، بلکہ دل کی گہرائیوں میں ان کی صداقت اور نتیجہ خیزی پر ایمان رکھیں۔

۳۔ اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کرکے، انہیں صرف وہاں صرف کریں جہاں صرف کرنے کا حکم قوانین خداوندی کی رو سے ملے۔

۴۔ وہ عہد جو انہوں نے اپنے خدا سے باندھا ہے (۹/۱۱۱)، اسے سچ کر دکھائیں۔

۵۔ مشکلات اور مصائب کے مقابلہ میں ثابت قدم اور مستقل مزاج رہیں۔

۶۔ نوعِ انسان کی خدمت کے لیے شاخِ ثمردار کی طرح جھکے رہیں۔

۷۔ اپنی ہر متاع کو نظامِ خداوندی پر نچھاور کر دینے کے لئے تیار رہیں۔

۸۔ قوانین خداوندی نے جہاں جہاں سے رکنے کا حکم دیا ہے، وہاں سے رکیں۔ ان پر جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں، ان کا پورا پورا خیال رکھیں۔

۹۔ اپنی عفت و عصمت کی پوری پوری حفاظت کریں۔

۱۰۔ غرضیکہ زندگی کے ہر قدم پر، قوانین خداوندی کو اپنے سامنے رکھیں۔

یہ ہیں وہ لوگ جنہیں خدا کا قانونِ مکافات، زندگی کی ہر تباہی سے محفوظ رکھے گا۔ اور انہیں ان کی سعی و عمل کا اجرِ عظیم عطا کرے گا۔ اس باب میں مردوں اور عورتوں میں کوئی فرق نہیں۔ (۳/۱۹۴ و ۴/۱۲۴)

قرآن عورتوں سے کہتا ہے کہ مرد اور عورتیں کارگاہِ حیات میں یکساں صلاحیتوں اور استعدادوں کی مالک ہیں۔ پھر تمہارے

دل میں یہ جذبہ کیوں بیدار ہو کہ تم نمائشِ زینت سے مردوں کی نگاہوں میں پرکشش بنو۔ تم کوئی جنس (COMMODITY) نہیں ہو جسے خریداروں کے لئے پرکشش بنا دیا جاتا ہے کہ اس کی قیمت بڑھ جائے۔ جو عورتیں اس کے باوجود اپنے دل سے اس خیال کو نکال نہ سکیں وہ ان سے کہتا ہے کہ

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ (۷/۱۷۶)

ہم تو چاہتے تھے کہ تمہیں، قرآن کے ذریعے، آسمان کی بلندیوں پر لے جائیں، لیکن تم ہو کہ اپنے پست جذبات کے پیچھے لگ کر زمین کی پستیوں کے ساتھ چپکے رہنا چاہتی ہو!

یعنی ان کے لئے خدا کا پیغام یہ ہے کہ :-

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو!
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گئی!"
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

اور یہی اس باب میں حرفِ آخر ہے۔

طاہرہ کے نام خطوط

پرویز صاحب کے خطوط کا سلسلہ ہماری تعلیم یافتہ نئی نسل میں بڑا مقبول ہوا ہے اور ان کے قلب و دماغ میں جو صحیح انقلاب آیا ہے اسکا بیشتر حصہ انہی خطوط کا رہینِ منت ہے۔ سلیم کے نام خطوط (تین جلدوں میں) نوجوان طلباء کے نام ہیں اور طاہرہ کے نام، طالبات کے لئے جس میں بالخصوص عورتوں سے متعلق مباحث کو قرآن مجید اور علوم حاضرہ کی روشنی میں سلجھایا گیا ہے۔ یہ سلسلہ خواتین کے حلقہ میں بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور انہوں نے اسے بڑا مفید پایا ہے۔ قیمت ۱۰/- روپے علاوہ محصول ڈاک۔

(۱) مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور

(۲) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قائدِ اعظمؒ ——— اور ——— دو قومی نظریّہ

علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ:

اسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں! کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ ہم (اہلِ پاکستان) کی راتیں ہی نہیں، بلکہ پوری زندگی شاید اس قسم کے سوال و جواب میں گذر جائے گی کہ ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا۔ اس مطالبہ کا جذبۂ محرکہ کیا تھا۔ اس کی اساس و بنیاد کیا تھی۔ اس سے مقصود کیا تھا؟ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس قسم کے سوالات درحقیقت موجود نہیں۔ انہیں پیدا کیا جاتا ہے۔ اور پیدا کیا جاتا ہے ان لوگوں کی طرف سے جنہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی، اور انہوں نے اسے ایک دل سے قبول نہیں کیا۔ اس قسم کے سوالات کو وقتاً فوقتاً ابھارنے سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ پرانی نسل جس نے تحریکِ پاکستان میں ذاتی طور پر حصہ لیا تھا، آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے، آنے والی نسل کے دل میں ہندوستان سے علیحدگی اختیار کر کے، ایک الگ مملکت (پاکستان) قائم کرنے کی وجہِ جواز کے بارے میں شکوک پیدا کئے جائیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی مملکت کے جواز کے بارے میں شکوک پیدا ہو جائیں تو اس کا استحکام متزلزل ہو جاتا ہے۔ یہی ان لوگوں کا منشاء ہے۔ انہوں نے، نہ شروع میں کلیتاً اس علیحدگی کو قبول کیا تھا، نہ اب کرتے ہیں۔ وہ علانیہ تو ایسا کہہ نہیں سکتے اس لئے اس قسم کے لطیف حربے استعمال کرتے ہیں جن پر گرفت نہ ہو سکے۔ چونکہ ملک میں اس انداز کے حربوں کی مدافعت کا کوئی انتظام نہیں اس لئے یہ حربے بڑی تیزی سے پھیلتے جا رہے ہیں۔ آپ کسی نوجوان تعلیم یافتہ سے پوچھ کر دیکھئے۔ وہ متعین طور پر کبھی نہیں بتا سکے گا کہ مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ کیا تھا اور اس مملکت کے جداگانہ وجود کا مقصود و منتہیٰ کیا! ہمیں افسوس ہے کہ جو حضرات اپنے آپ کو بہی خواہانِ پاکستان بھی کہتے ہیں، وہ بھی (بالعموم) اپنے اپنے مفادات کے حصول کی کوششوں میں مصروف ہیں اور اس قسم کے پیدا کردہ شکوک کے ازالہ کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ جب درخت جڑ بنیاد سے اکھڑ گیا تو اس کے پھل ان کی جھولی میں کس طرح گریں گے؟

طلوعِ اسلام اس حقیقت کو سنہ ۱۹۳۸ء سے دہراتے چلا آ رہا ہے کہ مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ نہ تو (دورِ حاضرہ کی عمومی اصطلاح کے مطابق) سیاسی تھا، نہ معاشی۔ یہ نہ ہندو کی تنگ نظری کا ردِ عمل تھا نہ مسلمان سرمایہ داروں کی ہوسِ

مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ

مفاد پرستی کا پیدا کردہ۔ یہ خالصۃً ہمارے دین کا تقاضا اور اسلام کا مطالبہ تھا۔ قرآنِ مجید کی رُو سے، اسلام ایک زندہ حقیقت بن نہیں سکتا جب تک ایک ایسا خطۂ زمین نہ ہو جس میں کتاب خداوندی کے احکام، آزادانہ نافذ کیے جا سکیں۔ اسے اسلامی مملکت کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو اجاگر کیا اور بتایا کہ ایسی مملکت کی عمارت کا سنگِ بنیاد قرآن کا پیش کردہ یہ ابدی اصول ہے کہ مسلمان، ایمان کے اشتراک کی بنا پر تمام غیر مسلموں سے الگ، ایک منفرد قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، نہ مسلمان اور غیر مسلم مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں، نہ خود مسلمانوں میں مختلف قومیں ہو سکتی ہیں۔ یہی وہ قوم (اُمّتِ مسلمہ) ہے جو اپنی آزاد مملکت میں قرآنی اقدار و احکام کے مطابق اپنا معاشرہ یا نظام قائم کرتی ہے۔ سیاست۔ معیشت۔ تمدن۔ معاشرت، غرضیکہ انسانی زندگی کے تمام مختلف شعبے، اسی نظام کے گوشے یا پہلو ہوتے ہیں۔

یہ تھا مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ جسے علامہ اقبال نے پیش کیا اور جس کے مطابق قائدِاعظمؒ کی مخلصانہ سعی و کاوش سے اس نے عملی شکل اختیار کی اور مملکتِ پاکستان وجود میں آ گئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ (۱۹۷۷ء) کے یومِ آزادی کی تقریب پر میں نے واضح کیا تھا کہ قائدِاعظمؒ کس طرح تحریکِ پاکستان کے دوران، اور حصولِ پاکستان کے بعد اس حقیقت کو دہراتے رہے کہ پاکستان کے آئین و قوانین کی بنیاد قرآن مجید پر ہوگی۔ (میرا یہ خطاب طلوعِ اسلام میں چھپ گیا، اور پھر الگ پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع ہو گیا تھا) امسال میں، اس حقیقت کے دوسرے پہلو کو سامنے لانا چاہتا ہوں کہ انہوں نے کس طرح، اسلام کے اس دوسرے اصول —— یعنی مسلم قومیت کے نظریہ کو، جسے اصطلاحاً دو قومی نظریہ کہا جاتا ہے۔ اپنے مطالبہ کی بنیاد قرار دیا اور اسے اپنی عمرِ عزیز کے آخری حصہ میں، عام کرتے رہے۔ اس نظریہ کی وضاحت کی خصوصیت سے ضرورت اس لئے بھی پیش آ گئی ہے کہ آجکل پھر اس فتنہ کو ہوا دی جا رہی ہے کہ قائدِاعظمؒ، وطنیت کی بنا پر متحدہ قومیت کے قائل تھے۔ قبل اس کے کہ میں قائدِاعظمؒ کے خلاف اس ناقابلِ تصور اتہام کی طرف آؤں، ضروری معلوم دیتا ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے نظریۂ قومیت کی مختصر طور پر وضاحت کر دی جائے۔ مختصر طور پر اس لئے کہ میں گذشتہ چالیس سال میں، اس موضوع پر، تفصیلی طور پر اس قدر لکھ چکا ہوں کہ اس سے ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔

انسانوں کی تقسیم

دنیا میں جب سے انسانوں نے باہمی مل جل کر رہنے کی زندگی اختیار کی ہے انہوں نے اپنے آپ کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ شروع شروع میں انسان قبائلی زندگی بسر کرتا تھا۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ سے جُدا۔ اور مختلف قبائل ایک دوسرے کے دشمن۔ ان میں باہمی لڑائیاں اور خونریزیاں ہوتی تھیں۔ قبائلی عصبیت کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی شخص اپنے قبیلہ کے کسی ایک فرد کو قتل کر دیتا تو اس کا جرم صرف اسی صورت میں معاف ہو سکتا تھا کہ وہ کسی دوسرے قبیلے کے دو آدمیوں کو جا کر قتل کر دے۔ قبائل پھیلے تو انہوں نسلی تقسیم کی شکل اختیار کر لی۔ منگولی نسل کے افراد آریائی نسل کے دشمن اور آریائی نسل کے لوگ سامی نسل کے خون کے پیاسے۔ یہی امتیازات آگے بڑھے تو انہوں نے وطنی تفریق کی صورت اختیار کر لی۔ ایک خطۂ زمین میں بسنے

والے ایک قوم کے افراد اور دوسرے خطہ کے باشندے دوسری قوم کے لوگ۔ دریا کے اس پار بسنے والے ایک قوم سے متعلق۔ اور اُس پار رہنے والے دوسری قوم کے افراد۔ اس تقسیم کو دورِ حاضر کی سیاسی اصطلاح میں نیشنلزم

نیشنلزم

کہتے ہیں۔ اور یہی وہ نہج زندگی ہے جس تک انسان تنہا عقل کی رُو سے بیسویں صدی تک پہنچا ہے۔ اس تقسیم کا احساس کس جذبہ پر مبنی ہے اور نیشنلزم کی دیواریں کن بنیادوں پر استوار ہوتی ہیں، اس کے متعلق ہم سے نہیں بلکہ خود نیشنلزم کے پرستاروں کی زبان سے سنیئے۔ پروفیسر کوبن اپنی کتاب (THE CRISIS OF CIVILIZATION) میں لکھتا ہے کہ:-

> قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور عداوت پر پرورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان اقوام کا جذبۂ عداوت و پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر بھی ختم نہیں ہو جاتا۔ جونہی کوئی قوم اپنے حقِ استقلال و خود مختاری کو مستحکم کر لیتی ہے تو ان اقوام کو دبانا شروع کر دیتی ہے جو اپنے لئے خود مختاری کی مدعی ہوں .... ان وجوہات کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچا جائے گا کہ کسی نظامِ حکومت کے لئے قومیت پرستی کی بنیاد بڑی ہی خطرناک ہے۔ (ص ۱۶۶)

اس قومیت پرستی کے ہاتھوں اس وقت دنیا کس قدر جہنم کے عذاب میں گرفتار ہے۔ یہ الگ موضوع ہے، جسے ہم کسی دوسری فرصت پر اٹھا رکھتے ہیں[۱]۔ اس وقت صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ یہ ہے انسانوں کی تقسیم و تفریق کا وہ معیار جس تک انسان اپنی تنہا عقل کی رو سے اس وقت تک پہنچا ہے۔

قرآن کی تعلیم

لیکن وحیٔ خداوندی نے کہا ہے کہ یہ معیار یکسر غلط اور وجۂ تذلیلِ انسانیت ہے۔ اس نے کہا کہ یہ بات کہ ایک شخص کس ماں باپ کے گھر میں پیدا ہو گیا اور اس نے کس سرزمین میں جنم لے لیا، کوئی ایسا معیار نہیں جس کی بنا پر اسے دوسری نسل یا دوسرے ملک کے انسانوں سے الگ قرار دیا جائے۔ یہ تقسیم تو خالص حیوانی سطحِ زندگی کی تقسیم ہے جسے انسانیت سے کچھ واسطہ نہیں ہو سکتا۔ اس نے اعلان کیا کہ تمام دنیا کے انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ (كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً) اس لئے نسل یا وطن کی چار دیواریاں ان میں تفریق و تمیز پیدا نہیں کر سکتیں۔ ان میں تمیز پیدا کرے گی وہ چیز جو ایک انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے دوسرے انسان سے ممتاز و متمیز کرتی ہے۔ مثلاً شریف انسان اور بدمعاش انسان ایک نہیں ہو سکتے، خواہ وہ ایک ہی باپ کے بیٹے کیوں نہ ہوں۔ جھوٹے اور سچے ایک گروہ کے افراد نہیں قرار دیئے جا سکتے۔ خواہ وہ ایک ہی خاندان کے افراد کیوں نہ ہوں۔ مجرم اور نیکوکار ایک جماعت سے متعلق نہیں سمجھے جا سکتے۔ خواہ وہ ایک ہی زبان کیوں نہ بولتے ہوں۔ امن پسندوں اور قانون شکنوں کو ایک نہیں خیال کیا جا سکتا خواہ وہ ایک ہی ملک میں کیوں نہ رہتے ہوں۔ ایک شریف انسان اور اس کا بدمعاش بیٹا حیوانی سطح پر (BIOLOGICALLY) باپ اور بیٹا کہلا سکتے ہیں۔ لیکن انسانیت کی سطح پر ان میں باہمی کوئی تعلق نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ تھا انسانوں میں باہمی تفریق و تقسیم

---

[۱] جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ وہ اس اجمال کی تفصیل کے لئے میری کتاب "انسان نے کیا سوچا؟" کا مطالعہ فرمائیں۔

کا وہ اصول جسے وحیٔ خداوندی نے عطا کیا۔ چنانچہ آپ قرآن میں دیکھئے۔ وہ کہیں (اسلامی لفظ نگاہ سے) عرب کی قوم یا ایران کی قوم۔ روم کی قوم یا یونان کی قوم کا ذکر نہیں کرتا۔ وہ ذکر کرتا ہے قومِ المجرمین اور قومِ الفاسقین کا۔ قومِ الظالمین اور قومِ الکاذبین کا۔ جب وہ قومِ المجرمین کہتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ مجرم، خواہ وہ دنیا کے کسی ملک میں بستے ہوں اور کسی خاندان، نسل یا قبیلہ سے متعلق ہوں وہ سب ایک قوم کے افراد ہیں۔ انہی جزئیات کو اس نے ایک عالمگیر کلیہ کے اندر سمو کر رکھ دیا جب کہا کہ دنیا کے تمام وہ لوگ جو مستقل اقدارِ انسانیت کی صداقت پہ یقین رکھتے ہوں ایک قوم کے افراد ہیں اور تمام ایسے لوگ جو اس اصول سے انکار کریں، دوسری قوم کے افراد۔ پہلی

قرآنی معیارِ قومیت

چیز اس کی اصطلاح میں ایمان کہلاتی ہے۔ اور دوسری کو کفر (یعنی انکار) کہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اس نے تمام روئے زمین کے انسانوں کی تقسیم کا معیار کفر اور ایمان قرار دے دیا۔ مومن ایک قوم کے افراد اور غیر مومن دوسری قوم کے لوگ۔ یہی نوعِ انسانی کی وہ عالمگیر تقسیم ہے جس کی طرف اس نے سورۂ تغابن کی دوسری آیت میں یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے:۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُم مُّؤْمِنٌ (۶۴/۲)

اللہ وہ ہے جس نے تم سب انسانوں کو پیدا کیا۔ سو تم میں سے ایک گروہ نہ ماننے والوں (کافروں) کا ہے اور دوسرا گروہ ماننے والوں (مومنوں) کا۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں "کافر" کا لفظ ایسے گھناؤنے معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ یہ ایک طرح کی گالی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن قرآن نے اسے ان معنوں میں استعمال نہیں کیا۔ اس نے اسے ان معنوں میں استعمال کیا ہے جن معنوں میں ہم آج (NON-MEMBER) کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا کے وہ تمام انسان جو ان اقدارِ انسانیت کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں جو وحی کی رو سے ملے ہیں (اور جو اب قرآن کے اندر محفوظ ہیں) ایک گروہ۔ ایک جماعت۔ ایک قوم۔ ایک پارٹی کے ممبر ہیں۔ اور جو لوگ ان اقدار پر یقین نہیں رکھتے وہ اس پارٹی کے ممبر نہیں ہیں — یعنی وہ (NON-MEMBERS) کافر ہیں۔ بہرحال یہ قرآن کی رو سے دنیا کے تمام انسانوں میں قومیت کی تقسیم کا معیار اس کے نزدیک، دنیا میں قومیں صرف دو ہیں۔ مومنین کی قوم اور غیر مومنین کی قوم۔ وہ کہتا ہے کہ یہی وہ دو فریق ہیں جن میں شروع سے باہمی نزاع و پیکار چلی آ رہی ہے۔ چنانچہ جب وہ اس ضمن میں سب سے پہلی کش مکش کا ذکر کرتا ہے جو حضرت نوحؑ کے زمانے میں سامنے آئی تو وہ کہتا ہے کہ اس میں حضرت نوحؑ ایک طرف تھے اور ان کا

ازل سے تا امروز

حقیقی بیٹا دوسری طرف۔ جب حضرت نوحؑ اپنی قوم (جماعتِ مومنین) کے ساتھ کشتی میں سوار ہونے لگے تو انہوں نے اپنے بیٹے کو آواز دی اور کہا کہ ہمارے ساتھ آ جاؤ۔ وَلَا تَكُن مَّعَ الْكَافِرِينَ (۱۱/۴۲) "اور کافروں کے گروہ کے ساتھ نہ رہ"۔ لیکن جب وہ اپنی روش زندگی کو بدلنے پر آمادہ نہ ہوا تو حضرت نوحؑ (کا ہم وطن ہونا تو ایک طرف، ان) کا بیٹا ہونا بھی اس کے کسی کام نہ آیا اور وہ اپنی پارٹی والوں کے ساتھ ہلاک ہو گیا۔ اور جب حضرت نوحؑ نے خیال کیا کہ وہ ان کے اپنے خاندان (اہل) میں سے تھا تو وحیٔ خداوندی نے یہ کہہ کر اس کی صراحت کر دی کہ: إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ (۱۱/۴۶) "نہیں! وہ تیرے اہل میں سے نہیں تھا۔" اسی طرح جب حضرت ابراہیمؑ کے باپ نے اس صحیح روشِ زندگی کو اختیار کرنے سے انکار کر دیا تو آپؑ نے نہ

صرف باپ سے بلکہ پوری قوم سے یہ کہہ کر قطع تعلق کر لیا۔ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ..... (۱۹/۴۸) "میں تم سے اور جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو ان سب سے الگ ہوتا ہوں" اور اتنا ہی نہیں، بلکہ ان سے کہہ دیا کہ: اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ "ہم تم سے اور ان سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبودیت اختیار کئے ہو ان سب سے یکسر لے تعلق ہیں"۔ كَفَرْنَا بِكُمْ "ہم تم سے ہر رشتے کا انکار کرتے اور بیزاری کا اعلان کرتے ہیں"۔ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا .. "تم میں اور ہم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھلی کھلی عداوت اور نفرت رہے گی"۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ہم سے تعلق پیدا کرو، اور یہ عداوت محبت سے اور یہ نفرت رفاقت میں بدل جائے تو اس کا ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ کہ تم بھی اس راستے کی سچائی پر یقین کرو جو اللہ نے ہم سب کے لئے مقرر کیا ہے۔ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ (۶۰/۴)

اس لئے کہ اس عالمگیر اصولِ زندگی کی رُو سے اپنوں اور بیگانوں کا معیار خون یا وطن کا رشتہ نہیں۔ معیار یہ ہے کہ: فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ (۱۴/۳۶) "جو شخص میرے پیچھے پیچھے چلتا ہے (وہ کسی قبیلہ کا فرد اور کسی وطن کا باشندہ ہو .....) وہ میرے اپنوں میں سے ہے" اور میرے "اپنے" جو کسی دوسری راہ پر چلتے ہیں وہ میرے غیر ہیں۔ یہی تھا وہ معیار جس کے مطابق حضرت لوط ؑ کی بیوی کے متعلق کہہ دیا گیا کہ وہ بھی اپنوں میں سے نہیں بلکہ غیروں میں سے تھی اس لئے اس کا حشر انہی کے ساتھ ہوا۔ (۶۶/۱۰) قومیت کی تقسیم و تفریق کا یہی معیار تھا جو نوعِ انسانی کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا چلا آیا تا آنکہ دنیا کے سامنے وہ دور آ گیا جب وحی کی تکمیل ہو گئی۔ اور اس کے مطابق نبی اکرم ؐ کے مقدس

قومِ رسولِ ہاشمی

ہاتھوں ایک ایسی قوم کی تشکیل ہوئی جس نے ساری دنیا پر روزِ روشن کی طرح واضح کر دیا کہ قومیت کا صحیح معیار کیا ہے۔ اس تشکیلِ قومیت کے مطابق حبش کا بلال۔ فارس کا سلمان۔ اور روم کا صہیب (رضی اللہ تعالےٰ عنہم) محمد عربی کی "اپنی قوم" کے افراد تھے اور مکہ کا ابوجہل اور (حقیقی چچا) ابولہب "غیر قوم" کے افراد۔ قومیت کی اس تقسیم کا عملی مظاہرہ بدر کے میدان میں نکھر کر سامنے آ گیا جب آسمان کی آنکھ نے یہ نظارہ دیکھا کہ حضرت ابوبکر رضؓ ایک طرف تھے اور ان کا بیٹا دوسری طرف۔ حضرت حذیفہ رضؓ ادھر تھے تو ان کا باپ عتبہ دوسری طرف، حضرت عمر رضؓ اِس طرف تھے تو ان کا ماموں اس طرف۔ حضرت علی رضؓ اِدھر تھے تو ان کا بھائی عقیل اُدھر۔ نہیں! اور آگے بڑھئے۔ اِدھر خود محمدؐ تھے تو ان کے مقابل آپؐ کے حقیقی چچا عباس اور داماد ابوالعاص۔ یہ تھی وہ تقسیمِ انسانیت، جو وطن، رنگ، زبان، نسل، رشتہ داری کے تمام حدود و ثغور سے بلند ہو کر، خالص ایمان اور کفر کے معیار پر وجود میں آئی تھی۔ یہ تھی وہ اُمتِ محمدیہؐ۔ وہ ملتِ اسلامیہ۔ وہ جماعتِ مومنین جو دنیا کے مختلف حصوں کے اُن انسانوں پر مشتمل تھی جن میں وجہِ اشتراک صرف ایمان تھا۔ یہی تھی وہ تقسیم جس کے متعلق کہہ دیا کہ مومنین کی جماعت کے افراد بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (۸/۷۲) ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز ہیں اور ان کے مقابلہ میں نہ ماننے والوں (کفار) کی قوم بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (۸/۷۳) ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز ہیں۔ اس کے بعد اس قوم مومنین کو تاکید کر دی کہ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ "اے جماعتِ مومنین۔ تم اپنے سوا اور کسی کو اپنے رازداں میں شریک نہ کرو۔ اس لئے کہ: لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا "یہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے"۔ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ۔

ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ تم کسی نہ کسی مصیبت میں الجھے رہو۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَکْبَرُ۔ ان کے بغض و عداوت کی بعض باتیں تو ان کے منہ پر آجاتی ہیں۔ لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا رہتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ قَدْ بَیَّنَّا لَکُمُ الْاٰیٰتِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ٥ (۳/۱۱۸) ہم نے تمہیں واضح طور پر ان امور سے آگاہ کر دیا ہے۔ اگر تم عقل و فکر سے کام لوگے (تو زندگی کے صحیح راستے پر چلتے جاؤ گے) ان نہ ماننے والوں کی حالت یہ ہے کہ: اِنْ تَمْسَسْکُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ۔ اگر کوئی بات تمہاری بھلائی کی ہوتی ہے تو اس سے انہیں سخت رنج پہنچتا ہے۔ وَاِنْ تُصِبْکُمْ سَیِّئَةٌ یَّفْرَحُوْا بِهَا (۳/۱۲۰) اور اگر تمہیں کچھ نقصان پہنچتا ہے تو یہ چیز ان کے لئے بڑی خوشی کا موجب ہوتی ہے۔[1]

یہ ہے قرآن کی تعلیم مسلم اور غیر مسلم کے باہمی تعلقات کی بابت۔ پھر چونکہ یہ قوم (مومنین) خانقاہ نشین راہبوں کی جماعت یا تارک الدنیا زاہدوں کا گروہ نہیں تھی بلکہ وہ قوم تھی جس کے دین کے متمکن (ESTABLISH) ہونے کے لئے حکومت لاینفک تھی (دیکھئے ۲۴/۵۵) اس لئے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ تم نے اپنی حکومت میں تمام فیصلے احکام خداوندی کے مطابق کرنے ہیں۔ فَاحْکُمْ بَیْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ (۵/۴۸) جو ایسا نہیں کرتا، وہ مومن نہیں کافر ہے۔ (۵/۴۴) قرآن کے ان اصولوں کی روشنی میں تمہیں جو قوانین مرتب کرنے پڑیں انہیں آپس میں ایک دوسرے کے مشورے سے طے کیا کرو۔ (وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ۔ ۴۲/۳۸) ان میں کسی غیر کو شریک نہ کیا کرو۔ جو ان مستقل اقدار کی صداقت پر یقین ہی نہیں رکھتا وہ تمہارے امورِ مملکت میں شریک و دخیل کیسے ہو سکتا ہے؟ چنانچہ آپ کو نہ رسول اللہ ؐ کی مجلس شوریٰ میں کوئی غیر مومن دکھائی دے گا نہ خلفائے راشدینؓ کی پارلیمان میں کوئی غیر مسلم۔ ان کی حکومت تمامتر جماعت مومنین پر مشتمل تھی اور غیر مسلم اس مملکت میں ایک ایسی اقلیت کی حیثیت سے رہتے تھے جن کی حفاظت کی ذمہ داری ان کے سر پر تھی۔ وہ "قوم مسلم" کے افراد نہیں تھے۔

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے مسلم قومیت کا نظریہ جو دین میں اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبالؒ نے اسی نظریہ کو اجاگر کیا اور اسی کو لے کر قائداعظمؒ تحریک پاکستان کے لئے میدان میں نکلے۔ وہ اس تحریک کے دوران کس طرح اس نظریہ کو بار بار دہراتے رہے، اس کی تفصیل ابھی آپ کے سامنے آئے گی لیکن میں سب سے پہلے ان کا ایک ایسا فقرہ پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جس میں انہوں نے پوری تفصیل کو سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ انہوں نے ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک تقریر میں کہا:

قائداعظمؒ کے ارشادات

> پاکستان اس دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم، مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں ہنوز مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔

بات کس قدر واضح ہے کہ جب یہاں پہلی بار ایک غیر مسلم، اسلام لے آیا، تو اس ملک میں دو قوموں کا وجود عمل میں آگیا۔ اور یہی پاکستان کی بنیاد ہے۔ اس تقریر کے دو ہفتے بعد، انہوں نے (۲۱ مارچ ۱۹۴۴ء کو) پنجاب سٹوڈنٹس فیڈریشن کے

---

[1] عدم گنجائش کے باعث یہاں صرف انہی آیات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مزید آیات کے لئے دیکھئے ۳/۳۲ نیز ۴/۸۹ نیز ۴/۱۳۹ نیز ۴/۱۴۴ نیز ۵/۵۵ نیز ۵/۸۳ نیز ۹/۱۰ نیز ۵۸/۲۲ نیز ۶۰/۱۰-۱۱۔

ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:-

> میں نہیں سمجھتا کہ کوئی دیانتدار آدمی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ مسلمان بجائے خویش ہندوؤں سے الگ مستقل قوم ہیں۔

انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے، ایڈورڈز کالج - پشاور، میں ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو کہا تھا۔

> ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین، ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

جداگانہ قومیت کا یہی وہ تصور تھا جس کی مخالفت ہندوؤں کی طرف سے اس شدومد کے ساتھ ہوئی تھی۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے، آل انڈیا نیشنل کنونشن کے خطبۂ صدارت میں (مارچ ۱۹۳۷ء میں) کہا تھا کہ:-

> ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو، مسلمان کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملکوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں۔

انہوں نے اپنی سوانح عمری میں لکھا تھا:-

> مسلم قومیت کا تخیل صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے۔

جب قائداعظمؒ نے اس تصورِ قومیت پر بار بار زور دیا تو مسٹر گاندھی نے انہیں (مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۴ء کو) ایک خط میں لکھا:-

> میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کریں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان، اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی رہنا چاہیئے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

مسٹر گاندھی کا یہ خط، یوں سمجھیئے کہ قائداعظمؒ کے اس خط کے جواب میں تھا جس میں انہوں نے، مسٹر گاندھی کو لکھا تھا کہ:-

> اس باب میں مجھے نہ کسی قسم کا دعویٰ ہے، نہ شک و شبہ، کہ نہ ہندوستان میں ایک قوم بستی ہے اور نہ ہی یہ ملک ایک ہے۔ یہ برصغیر مختلف اقوام کا مجموعہ ہے جن میں ہندو اور مسلمان دو بڑی بڑی قومیں ہیں۔ آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے لیکن آپ سے جب یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کونسی قوت محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے، کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا معاشرتی اصلاح ہے، تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے... ... (لہٰذا مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے نہیں ہیں) آج انسانی سعی و کاوش کا دائرہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت بن چکا ہے۔ آپ تمدنی، معاشی، سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب کو نوعِ انسانی کے معاملات سے واسطہ نہیں، میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے

> تو وہ انسانی زندگی نہیں محض خود آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔
>
> (جناح کا خط بنام گاندھی - جنوری ۱۹۴۰ء)

مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۴۰ء تحریک پاکستان کی تاریخ میں نشانِ منزل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں پاکستان کا ریزولیوشن پاس ہوا تھا۔ اس اجلاس کے خطبۂ صدارت میں قائداعظمؒ نے فرمایا تھا:-

> میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندو ازم کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں "مذہب" نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت کا تخیل ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے۔ ہندو اور مسلمان مذہب کے ہر معاملہ میں دو جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر ہیں۔ دو ایسی قوموں کو ایک نظام سلطنت میں یکجا کر دینا باہمی منافرت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا گیا ہو۔

اس کے ایک سال بعد انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس مدراس، کے خطبۂ صدارت میں اپنے اس دعویٰ کا اعادہ کرتے ہوئے فرمایا:-

> مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کر لینے یا ان کے نظریات یا ملی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش بھی کی جائے گی، اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائیگا۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کر کے رہیں گے۔

قائداعظمؒ نے اس دعویٰ کو اس شد و مد سے دہرایا کہ اس کے مخالفین تک کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ چنانچہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ایک ممتاز رکن، مسٹر این، سی، دت نے اپنے ابنائے قوم کے نام ایک کھلی چٹھی میں (جو اخبار مدینہ بجنور کی یکم فروری ۱۹۴۲ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی) لکھا تھا:-

> ان حالات میں میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم قضیہ کا حل یہی ہوگا کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو قومیں سمجھ لیا جائے اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے متعلق ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا جائے۔ مسٹر جناح نے حال ہی میں گاندھی جی کو جواب دیتے ہوئے متحدہ قومیت کے تصور کو سراب کے لفظ سے تعبیر کر کے اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ یہ میرے خیال میں اب نہیں تو کل حقیقت ہو کر رہے گا.... میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پاکستان کے خیال سے ڈرنا نہیں چاہیئے۔
>
> البتہ اس میں مناسب ترمیم و اصلاح کر کے، اسے اپنے حسبِ حال بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

اور اس حقیقت کو، بالآخر ہندو اور انگریز دونوں کو تسلیم کرنا پڑا اور دو قومی نظریہ کی بنا پر پاکستان وجود میں آ گیا۔

اس موضوع پر، قائداعظمؒ کی تقاریر اور بیانات سے اور بھی بہت کچھ پیش کیا جا سکتا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ انہی اقتباسات سے واضح ہو گیا ہوگا کہ دو قومی نظریہ کے متعلق ان کے خیالات اس قدر صاف اور واضح تھے کہ اس باب میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی وہ کس طرح اس حقیقت کو دہراتے رہے، اسے ذرا آگے چل کر پیش کیا جائے گا۔ اس وقت میں اس فتنہ کی طرف آنا چاہتا ہوں جسے ان

لوگوں کی طرف سے جو ہندوؤں سے علیحدگی کے غم و غصہ کی آگ اپنے سینے میں دبائے بیٹھے ہیں، بار بار اُبھارا جاتا ہے۔

۱۱ اگست کی تقریر

بات یوں ہوئی کہ جب قائداعظمؒ کو، پاکستان کی پہلی مجلس آئین ساز کا صدر منتخب کیا گیا تو انہوں نے (۱۱ اگست ۱۹۴۷ء) کو اس مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے ایک تقریر فرمائی۔ اس میں انہوں نے پہلے، قبل از تقسیم کے ہندوستان کے کوائف و حوادث پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کس قدر باہمی عداوت کی آگ بھڑکتی رہتی تھی۔ وہاں مسلمان اقلیت میں تھے اور ہندو اکثریت میں، اس لئے وہاں ہمیشہ مسلمانوں کا خون خرابہ ہوتا تھا۔ پاکستان میں صورتِ حالات اس کے برعکس ہوگی۔ یہاں مسلمان اکثریت میں ہو گئے اور ہندو اقلیت میں، اس لئے ہندوؤں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اب یہاں ان کے ساتھ وہی کچھ ہوگا جو کچھ وہ وہاں مسلمانوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ ویسے بھی ہندو مؤرخوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے دورِ حکومت کا ایسا بھیانک اور دہشت انگیز نقشہ کھینچ رکھا ہے جس سے ہندو عوام خوف و ہراس سے کانپ اُٹھتے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی نے، ان کی اسی افسانوی تاریخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ :-

تمہیں لے دے کے ساری داستاں سے یاد ہے اتنا   کہ عالمگیر ہندو کش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

بنا بریں یہاں کا ہندو اس لئے بھی خائف ہو سکتا تھا کہ اب یہاں جو مسلمانوں کی حکومت قائم ہو رہی ہے تو ماضی کی تاریخ کو یہاں بھی دہرایا جائے گا۔ ان تاثرات کو سامنے رکھتے ہوئے قائداعظمؒ نے اپنی اس تقریر میں ہندوؤں کو یقین دلایا کہ پاکستان میں ایسا نہیں ہوگا۔ انہوں نے جملہ اہلِ پاکستان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا :-

> تم آزاد ہو۔ تمہیں اس امر کی کامل آزادی ہے کہ تم اپنے مندروں میں جاؤ یا مسجدوں میں یا مملکتِ پاکستان میں کسی اور پرستش گاہ میں۔ تمہاری ذات یا مسلک کچھ بھی ہو، امورِ مملکت کو اس سے کچھ تعلق نہیں ہوگا۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ (اور تو اور) انگلستان کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وہاں عیسائیوں ہی کے دو فرقوں —— رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ —— میں کس قدر کشت و خون ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس مملکت نے، اپنی کامل ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے، رفتہ رفتہ ان مناقشات کو مٹا دیا، اور اب تم پورے انصاف سے کہہ سکتے ہو کہ وہاں رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ نہیں، بلکہ ایک مملکت کے شہری بستے ہیں"۔ اسی طرح :-

> میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنے سامنے یہ نصب العین رکھنا چاہیئے کہ ایک وقت کے بعد یہاں نہ ہندو، ہندو رہے گا، نہ مسلمان، مسلمان —— مذہبی نقطۂ نگاہ سے نہیں، کیونکہ وہ تو ہر فرد کے ذاتی عقیدہ کا سوال ہے۔ ایسا، ان سب کے پاکستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے، سیاسی نقطۂ نگاہ سے ہوگا۔

یہ ہیں قائداعظمؒ کی تقریر کے وہ الفاظ، جنہیں، ان لوگوں کی طرف سے جنہیں پاکستان کا وجود ایک آنکھ نہیں بھاتا، وقتاً فوقتاً اچھالا جاتا، اور کہا جاتا ہے کہ دو قومی نظریہ کو قائداعظمؒ نے خود ہی ختم کر دیا تھا۔ لہٰذا، پاکستان میں قومیت کا معیار، اسلام نہیں، وطن کا اشتراک ہے، جس طرح دنیا کی دیگر سیکولر مملکتوں (بالخصوص ہندوستان میں) معیارِ قومیت یہی ہے۔ وہ جب بھی اس فتنہ کو ہوا دیتے ہیں تو انہیں سمجھایا جاتا ہے کہ قائداعظمؒ کے ان الفاظ کو، ان کی تقریر کے سیاق و سباق سے الگ کر کے، ان سے یہ مستنبط کرنا کہ قائداعظمؒ نے اسلام کے نظریۂ قومیت کو ختم کر کے سیکولر

نظریۂ قومیت اختیار کر لیا تھا، پاکستان اور خود قائدِ اعظمؒ کے خلاف اس قدر زیادتی ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس فتنہ کو آجکل پھر ابھارا جا رہا ہے۔ اس لئے اس (عمداً پیدا کردہ) غلط فہمی کا ازالہ نہایت ضروری ہے۔ آیئے ذرا تعصب سے بالاتر ہو کر دیکھیں کہ صورتِ حالات کیا سامنے آتی ہے۔

صحیح صورت

(۱) سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ اگر مندرجہ بالا الفاظ کسی ایسے شخص کی زبان سے نکلے ہوں، جس نے نظریۂ قومیت کے متعلق اس سے پہلے کچھ نہ کہا ہو (یا وہ متحدہ قومیت کا قائل رہا ہو) تو ان (الفاظ) سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کہنے والے کا مسلک یہ ہے کہ مذہب کو سیاست سے کوئی واسطہ نہیں اور قومیت کا معیار مذہب نہیں، وطن ہے۔ لیکن جب اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ یہ الفاظ اس شخص کی زبان سے نکلے ہیں جو دس برس تک، انہی دو بنیادوں پر، تمام دنیا کے خلاف برو آزما رہا تھا تو ان سے اس قسم کے نتائج مستنبط کرنے کے لئے جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیئے، ذرا تامل برتنا چاہیئے۔

(۲) ہم نے بعض لوگوں کو یہاں تک کہتے بھی سنا ہے کہ بے شک قائدِ اعظمؒ دس برس تک یہ دعویٰ کرتے رہے لیکن یہ درحقیقت ایک وکیلانہ حربہ تھا جسے انہوں نے اپنا مقدمہ جیتنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ جب کیس کا فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا تو اس حربہ کی ضرورت نہ رہی۔

ایسا کہنے والے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ یہ کچھ ہم کس شخص کے متعلق کہہ رہے ہیں! ہم بربنائے عقیدت نہیں کہتے، بلکہ یہ حقیقت ہے کہ جو شخص قائدِ اعظمؒ کے کیریکٹر کے متعلق کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے، وہ ان کے خلاف اس قسم کا الزام عائد کرنے کی کبھی جرأت نہیں کرے گا۔ حق گوئی و بے باکی، ان کے کردار کی ایسی خصوصیت تھی جس کا اعتراف ان کے دشمنوں تک کو تھا۔ لندن ٹائمز، ان کے دوستوں کا نہیں، بہرحال دشمن قوم کا ترجمان تھا۔ اس نے قائدِ اعظمؒ کی وفات پر لکھا تھا:۔

> قائدِ اعظمؒ نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ ذہنی لچک نہیں تھی جو انگریز کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصہ ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت واضح اور شفاف ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہیں تھی۔

لہٰذا، یہ کہنا کہ قائدِ اعظمؒ دس سال تک ایسے نظریات کو (بطور حیلہ سازی) پیش کرتے رہے جن پر انہیں ایمان نہیں تھا، حقیقت کو جھٹلانا ہے۔ ان کا کردار اس سے بہت بلند تھا۔ جس شخص نے اپنے عمر بھر کے نیشنلزم کے عقیدہ کو جھٹک کر الگ کر دیا اور اس میں نہ مداہنت کو بار پانے دیا نہ کسی مصلحت کو، وہ اس قسم کی منافقانہ روش کبھی اختیار نہیں کر سکتا۔

(۳) ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ قائدِ اعظمؒ نے جب مجلسِ آئین ساز سے خطاب کیا تھا تو ملک کے حالات کیا تھے؟

پس منظر

تقسیمِ ہند کے ساتھ ہی ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہو گیا۔ اس سے وہاں کے مسلمانوں کے دل میں خوف دہشت کے ایسے جذبات ابھرے کہ انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ، پاکستان میں آ کر پناہ لے لیں۔ لیکن ان وحشی درندوں نے ان

کے نہتے قافلوں کو بھی نہ چھوڑا۔ دانستہ طور قتل و غارت گری کی وارداتیں ہوتی رہیں۔ ان کی نوجوان لڑکیوں کو ہزاروں کی تعداد میں چھین جھپٹ کر لے گئے۔ ان کے معصوم بچوں کو نیزوں کی انیوں پر اچھالا گیا۔ اور تو اور، دلی سے جو گاڑیاں خود حکومت کے عملے کو لے کر روانہ ہوئیں، یہاں پہنچنے پر ان میں سے زندہ انسانوں کے بجائے لاشوں کے ٹکڑے برآمد ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ان وحشیانہ مظالم کا ردِ عمل پاکستان کے بعض حصوں میں بھی ہوا۔ اور اس سے یہاں کے غیر مسلم باشندوں (بالخصوص ہندوؤں) کے دل میں خوف و ہراس، بے اعتمادی، اور بے یقینی کے وساوس پیدا ہوئے۔ آپ سوچیئے کہ ایک مملکت، جس کی عمر ابھی ایک دن کی بھی نہ ہوئی ہو۔ اس قسم کے لرزہ انگیز حالات سے دوچار ہو۔ پھر اس کی کیفیت یہ ہو کہ نہ اس کے پاس ابھی اپنی فوج ہو، نہ اسلحہ، نہ سامان ہو نہ پیسہ، تو اس کے سربراہ کے دل پر اس سلسلہ میں کیا نہ گزرتی ہوگی! اس کے ساتھ ہی اسے بھی ذہن میں رکھیئے کہ پاکستان کے اندر خود ایسے عناصر موجود تھے جو ایک طرف یہاں کے غیر مسلموں کے دل میں خوف و ہراس پیدا کر رہے تھے۔ اور دوسری طرف انہیں اشتعال بھی دلا رہے تھے۔ ہندوستان کے اخبارات یہاں کی غیر مسلم اقلیتوں کے خلاف مظالم کی فرضی داستانیں بیان کرکے وہاں کے مسلمانوں سے انتقام کی آگ کو تیز سے تیز تر کرتے چلے جا رہے تھے۔ اس کے لئے نہایت ضروری تھا کہ یہاں کی غیر مسلم اقلیتوں کو پورا پورا یقین دلایا جائے کہ وہ یہاں ہر طرح سے محفوظ رہیں گی۔ اور مذہب کی بنا پر ان سے کوئی ناروا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں قائد اعظمؒ کو پاکستان میں اپنی پہلی تقریر کرنی پڑی۔ قائد اعظمؒ بڑی متوازن شخصیت کے حامل تھے۔ وہ کبھی جذبات سے مغلوب نہیں ہوا کرتے تھے، لیکن جن حالات سے اس وقت ملک دوچار تھا اور اتنی عظیم ذمہ داریوں کا جو بوجھ اس مملکت پر آپڑا تھا، اس کے سربراہ کا ان سے متاثر ہو جانا کوئی غیر فطری امر نہیں تھا۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، وہ غیر مسلموں کو یقین دلانا چاہتے تھے کہ انہیں یہاں اسی قسم کی حفاظت ملے گی جیسی مسلمانوں کو۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا تھا اس سے ان کا مقصد یہی تھا۔ لیکن (ہمیں اعتراف ہے کہ وہ اپنے معمول کے خلاف) شدتِ جذبات میں الفاظ کے انتخاب میں کما حقہٗ احتیاط نہ برت سکے۔ بایں ہمہ ان الفاظ سے یہ مستنبط کرنا کہ جس نظریہ کی رو سے انہوں نے دس سال تک ہندو اور انگریز سے جنگ کرکے پاکستان حاصل کیا تھا وہ اس نظریہ کو پہلے ہی دن اس طرح نذرِ آتش کر دیں گے، بڑی زیادتی ہے۔ کوئی باہوش انسان اسے باور نہیں کرے گا۔

میں نے جو ابھی کہا ہے کہ قائد اعظمؒ کی اس تقریر کا مقصد غیر مسلم اقلیتوں کو یقین دلانا تھا کہ ان سے رواداری اور حسنِ سلوک کا برتاؤ کیا جائے گا، تو یہ ہماری اپنی تعبیر نہیں۔ واقعات اس کے شاہد ہیں۔ انہوں نے ۱۱ اگست کی مذکورہ بالا تقریر سے ایک ماہ پہلے، ۱۴ جولائی کو، نامزد گورنر جنرل کی حیثیت سے، دہلی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا تھا۔ اس کانفرنس میں ان سے اقلیتوں کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:-

> میں ان وعدوں سے جو میں نے بار بار اقلیتوں کے بارے میں کئے ہیں، منحرف نہیں ہوں گا۔ میں نے بارہا اقلیتوں کے بارے میں کہا ہے کہ انہیں پورا پورا تحفظ حاصل ہوگا۔ میں جو بھی کہتا ہوں اس کا وہی مفہوم ہوتا ہے اور جو کچھ میں کہہ چکا ہوں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اقلیتوں کو خواہ وہ کسی جماعت اور کسی فرقے سے متعلق ہوں ہر طور پر پوری طرح تحفظ دیا جائے گا۔ ان کو اپنی مذہبی رسومات و عبادات کی پوری آزادی ہوگی۔ اس میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ ان کی جان، ان کے مال اور ان کے

> تمدن کی پوری حفاظت کی جائے گی اور انہیں بلا تفریق مذہب و ملت و رنگ ہر صورت میں پاکستان کا باشندہ تصور کیا جائیگا۔
>
> (بحوالہ نوائے وقت۔ مورخہ ۱۹ جنوری ۱۹۴۷ء)

آپ نے دیکھا کہ قائداعظمؒ نے اس میں، پاکستان کے غیر مسلم باشندوں کو اقلیتیں کہہ کر پکارا ہے۔ یہ ان کی ۱۱ اگست کی تقریر سے ایک ماہ پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد انہوں نے (اس تقریر کے تین ہی دن بعد) ۱۴ اگست کو مجلس آئین ساز کا افتتاح کیا۔

۱۱ اگست کے بعد

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی تقریر میں یہ کہہ دیا تھا کہ مجھے امید ہے کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں سے ویسا ہی کشادہ ظرفی اور رواداری کا سلوک کیا جائے گا جیسا شہنشاہِ اکبرؒ نے کیا تھا۔ قائداعظمؒ نے ماؤنٹ بیٹن کے اس مشورہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

> شہنشاہِ اکبر نے غیر مسلموں کے ساتھ جس مذہبی رواداری اور حسنِ سلوک کا ثبوت دیا، وہ ہمارے ہاں کوئی بعد کا وضع کردہ مسلک نہیں تھا۔ وہ مسلک ہمارے ہاں تیرہ سو سال پہلے سے چلا آرہا تھا جب حضور نبی اکرمؐ نے یہودیوں اور عیسائیوں پر فتح حاصل کر لینے کے بعد ان سے لفظاً ہی نہیں بلکہ عملاً انتہائی رواداری برتی اور ان کے مذہب اور عقائد کو عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا۔ مسلمانوں کی تمام تاریخ اس کی شاہد ہے کہ انہوں نے جہاں جہاں بھی حکومت کی (غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور حسنِ سلوک کے) انہی عظیم انسانیت ساز اصولوں پر عمل کیا اور انہی پر ہمیں بھی عمل کرنا چاہیئے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قائداعظمؒ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ پاکستان میں غیر مسلموں کی حیثیت کیا ہو گی؟ اس ضمن میں آپ اس نکتہ پر بھی غور فرمایئے کہ حضور نبی اکرمؐ نے جن یہودیوں اور عیسائیوں سے حسنِ سلوک کا برتاؤ کیا تھا، وہ مسلم قوم کا جزو نہیں بن گئے تھے۔ اسلامی مملکت میں ان کی حیثیت ذمیوں کی تھی۔ یہ حقیقت بجائے خویش اسلامی نقطہ نگاہ سے "دو قومی نظریہ" کا بین ثبوت ہے۔

اس کے بعد قائداعظمؒ قریب ایک سال تک زندہ رہے اور اس دوران میں انہوں نے بہت سے مواقع پر تقاریر کیں اور بیانات دیئے۔ جہاں جہاں بھی موقع ملا انہوں نے غیر مسلموں کو ہمیشہ اقلیت کہہ کر پکارا اور انہیں یقین دلایا کہ یہاں اُن سے رواداری کا برتاؤ کیا جائے گا۔ مثلاً انہوں نے ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو خالق دینا ہال کراچی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

> ایک اور سوال جو میرے دل میں بار بار اُبھرتا ہے، اقلیتوں کا مسئلہ ہے۔ میں نے جلوت اور خلوت میں بار بار اس امر پر زور دیا ہے کہ ہمیں اقلیتوں سے حسنِ سلوک کا ثبوت دینا چاہیئے۔ تقسیم ہند کے وقت اس امر کی ضمانت دی گئی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ لہٰذا جب تک اقلیتیں مملکت کی وفادار رہیں گی، انہیں یہاں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔

پھر انہوں نے ۳۰ اکتوبر کو یونیورسٹی سٹیڈیم لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

> اسلام ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں اور اقلیتوں کی پوری پوری حفاظت کرے۔ خواہ ان کا عقیدہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے اس کے باوجود ہمیں یہاں کی اقلیتوں کا پورا پورا تحفظ کرنا چاہیئے اور ان کے دل میں اس حفاظت کی طرف سے کامل اعتماد پیدا کرنا چاہیئے۔ ہمارا یہی رویہ ہمارے لئے باعثِ عزت اور وجہ افتخار ہونا چاہیئے۔

۳ر فروری ۱۹۴۸ء کو سندھ کے پارسیوں نے قائدِ اعظمؒ کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ حکومت اس امر کا خاص اہتمام کر رہی ہے کہ اقلیتوں کے دل سے' خوف اور بد اعتمادی کے تمام شبہات کا ازالہ کر دے"۔ انہوں نے ۱۹ر فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں کہا:۔

> اسلام ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم دوسرے اہل مذاہب کے ساتھ رواداری کا ثبوت دیں۔ جو لوگ بھی یہاں برضا و رغبت ہم سے تعاون کریں گے ہم ان کے اس تعاون کا گرم جوشی سے استقبال کریں گے۔

انہوں نے ۲۱ر مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

> ہر غیر جانبدار مبصر اس سے اتفاق کرے گا کہ ہم نے اپنی انتہائی مشکلات کے اس زمانے میں' اپنی اقلیتوں کی جس قدر حفاظت کی ہے اور اُن کا جتنا خیال رکھا ہے، ہندوستان میں اس کی کہیں مثال نہیں مل سکتی۔ میں اس موقع پر ایک بار پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستان کی اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کریں گے۔ پاکستان میں ان کی جان اور مال کی حفاظت ہندوستانی اقلیتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہو رہی ہے۔ پاکستان کے ہر شہری کی جان و مال کی حفاظت ہمارا ذمہ ہے اور ہم اس ذمہ داری کو مذہب و ملت کی تمیز سے بلند ہو کر پورا کرتے رہیں گے۔

اس کے بعد انہوں نے' اسی تقریر کے دوران فرمایا:۔

> اسلام نے ہمیں یہ سکھایا ہے ——— اور آپ مجھ سے متفق ہوں گے (کہ یہ ایک عظیم سبق ہے جو اس نے ہمیں سکھایا ہے) کہ آپ کچھ بھی ہوں، اول و آخر آپ مسلمان ہیں اور ایک قوم کے افراد ہیں۔ تم نے اپنے لئے ایک وسیع مملکت تراشی ہے۔ یہ مملکت آپ سب کی مشترکہ ملکیت ہے۔ یہ نہ پنجابی کی ہے نہ بنگالی کی۔ نہ سندھی کی ہے نہ پٹھان کی۔ یہ آپ سب کی ہے ...... اس لئے اگر تم ایک قوم بننا چاہتے ہو تو خدا کے لئے صوبائی تفریق کے خیال کو جھٹک دیجئے۔ صوبائی تفریق ایک لعنت ہے۔ ویسی ہی لعنت جیسی لعنت فرقہ بندی۔ شیعہ سنی۔ کی تفریق ہے۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے فرمایا:۔

> میں اس موقعہ پر ایک بار پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کریں گے۔

آپ نے دیکھا کہ اس تقریر کے پہلے اقتباس میں انہوں نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے انہیں "ایک قوم" کہا ہے اور دوسرے اقتباس میں، غیر مسلموں کو اقلیتیں ——— فرمائیے کہ ایسا کہنے والا "دو قومی نظریہ" کا علمبردار تھا' یا متحدہ قومیت کا؟

انہوں نے ۲۶ر مارچ ۱۹۴۸ء کو چاٹگام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ "ایک غیر جانبدار مبصر اس سے اتفاق کریگا کہ ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان نے اپنی اقلیتوں کے ساتھ کہیں بہتر سلوک کیا ہے۔ وہ یہاں ہمارے درمیان نہ صرف امن و اطمینان سے رہ رہی ہیں بلکہ انہیں اپنے قدم جمانے کی بھی پوری پوری آزادی حاصل ہے"۔

۱۳ر جون ۱۹۴۸ء کو کوئٹہ کے پارسیوں کے ایک وفد نے قائدِ اعظمؒ کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ:۔

> آپ کو معلوم ہے کہ میری اور میری حکومت کی یہ پالیسی ہے کہ پاکستان میں بلا تمیز مذہب و ملت' اور بلا لحاظ رنگ و نسل

ہر شخص کی جان، مال اور عزت کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی۔ اقلیتوں کو اس باب میں بالکل مطمئن رہنا چاہیئے۔

آپ نے دیکھا کہ قائدِ اعظمؒ اس تمام دوران میں پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو اقلیت کہہ کر پکارتے رہے۔ اور انہیں ان کی جان، مال اور عزت، آبرو کی حفاظت کا یقین دلاتے رہے۔ انہوں نے کہیں ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ یہاں مسلم اور غیر مسلم دونوں مل کر ایک قوم بن چکے ہیں، اس لئے اب ان میں کسی قسم کی تفریق و تمیز باقی نہیں رہی۔ اس کے برعکس وہ اس حقیقت کا اعادہ کرتے رہے کہ مسلمان اپنے مخصوص نظریۂ زندگی کی بنا پر ایک الگ قوم بنتے ہیں۔ انہوں ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے اس براڈکاسٹ میں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، کہا کہ:۔

یہاں کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمد رسول اللہ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے افراد ہیں جس میں حقوق، شرف و احترام اور تکریم ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنا بریں ہم میں وحدت اور اخوت کا بڑا گہرا اور خاص جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات، ہم اپنے نظریاتِ زندگی، نقطۂ نگاہ اور احساسات و رجحان کے مالک ہیں جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قائدِ اعظمؒ نے قومیت کی تشکیل کے لئے کون کون سے اجزا کو لاینفک قرار دیا؟ کیا یہ وہی اجزا نہیں جن کے امتزاج سے مسلم قوم یا امتِ مسلمہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے کہیں بھی یہ کہا تھا کہ ہم (پاکستان کے مسلم اور غیر مسلم) اشتراکِ وطن کی بنیاد پر ایک قوم بن چکے ہیں۔

پھر انہوں نے ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو مملکتِ پاکستان کی پہلی سالگرہ کے موقع پر اپنے اس پیغام میں جو ان کی زندگی کا آخری پیغام تھا پاکستان کو "دنیا کی سب سے بڑی مسلم سٹیٹ" کہہ کر پکارا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ انہوں نے اسے "مسلم سٹیٹ" کہا ہو، اس سے پہلے بھی انہوں نے اسے، ہر موقعہ پر، مسلم سٹیٹ ہی قرار دیا تھا۔

ہم پوچھتے ہیں دنیا بھر کے ماہرینِ سیاست سے کہ جو مملکت محض وطنیت کی بنیادوں پر استوار ہوئی ہو، اسے کبھی بھی، مسلم سٹیٹ، ہندو سٹیٹ یا عیسائی سٹیٹ کہا جا سکتا ہے؟ یاد رہے کہ وطنیت کی بنیادوں پر مختلف آئیڈیالوجی رکھنے والوں کے امتزاج سے جو قوم متشکل ہوتی ہو، اس کی مملکت ہمیشہ سیکولر ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کی زندگی کے آخری ایام میں متحدہ قومیت کے مؤید (مولانا) حسین احمد مدنی مرحوم نے کہا تھا کہ "قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ اس سے حضرت علامہ کے ساتھ ان کی بحث چل نکلی۔ اس بحث کے دوران علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ:۔

اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اول تو لادینی ہوگا، اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروا ہی۔

لہٰذا، قائدِ اعظمؒ کا مملکتِ پاکستان کو مسلم سٹیٹ کہنا خود اس امر کی شہادت ہے کہ وہ متحدہ قومیت کے قائل نہیں تھے۔

آخر میں آیئے ہم دیکھیں کہ قائدِ اعظمؒ کی گیارہ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کا مفہوم خود غیر مسلم اقلیتیں کیا سمجھتی تھیں۔ کیا انہوں نے یہ سمجھا تھا کہ اس سے قائدِ اعظم مسلمانوں اور غیر مسلموں کی متحدہ قومیت کا اعلان کر رہے ہیں، یا یہ کہ

اس سے مقصود غیر مسلم اقلیتوں کا تحفظ ہے ؛ مسٹر جوشوا فضل الدین ایک مشہور مسیحی لیڈر تھے (ان کا دو ایک سال اُدھر انتقال ہوا ہے) جب صدر ایوب نے لاء کمیشن کا تقرر کیا تو مسٹر جوشوا نے اس سوال پر بحث کی تھی کہ مجوزہ آئین کی بنیاد کیا ہونی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا۔ (RATIONALE OF PAKISTAN CONSTITUTION) (یہ پمفلٹ اس وقت ہمارے سامنے ہے) اس میں انہوں نے پہلے یہ واضح کیا تھا کہ سنہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان کی رو سے مملکتِ پاکستان کے دو بنیادی ستون تھے۔ یعنی :-

(۱) مملکتِ پاکستان کی بنیاد مذہب پر ہو گی۔ یہی وہ قدرِ مشترک ہے جو مشرقی اور مغربی بازوؤں میں وحدت پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔ اور

(۲) اقلیتوں کے لئے تحفظات۔

انہوں نے کہا تھا کہ مجوزہ آئین کو یہ دونوں شرائط پوری کرنی چاہئیں اس کے بعد انہوں نے قائداعظمؒ کی ۱۱ر اگست سنہ ۱۹۴۷ء (اور اس کے ساتھ ۱۴ر اگست سنہ ۱۹۴۷ء کی تقاریر) کے اقتباسات دے کر یہ کہا تھا کہ ان کی تعبیر میں انتہا پسندانہ رویّہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قائداعظمؒ کا مقصد یہ تھا کہ یہاں نہ ہندو، ہندو رہے نہ مسلمان، مسلمان۔ بلکہ دونوں کے امتزاج سے ایک متحدہ قوم متشکل ہو، جس کا لازمی نتیجہ سیکولر اندازِ حکومت ہو جائے، وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ مسٹر جوشوا نے ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا :-

یہ کہنا کہ تخلیقِ پاکستان کے بعد قائداعظمؒ نے ——— جو خود اس پاکستان کے خالق تھے ——— اپنی پہلی ہی تقریر میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جس سے اس بات کا دور کا بھی امکان ہے کہ اس سے پاکستان کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی، بالکل پاگل پن ہے۔ قائداعظمؒ نے اتنا ہی کہا تھا کہ پاکستان میں بلا لحاظ مذہب و ملت ہر ایک کو مساوی حقوقِ شہریت حاصل ہوں گے۔

اس کے بعد انہوں نے بڑی پتے کی بات کہی تھی اور وہ یہ کہ چونکہ پاکستان کو لامحالہ ایک مذہبی مملکت بننا ہے اس لئے اس امر کا فیصلہ کہ غیر مسلم اقلیتوں کو کس قسم کے حقوق اور تحفظات حاصل ہوں گے، اسلامی فقہ کی رُو سے ہی ہو سکے گا۔ اور اس کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں امید ہے کہ اس ضمن میں اسلامی فقہ کی تعبیر مذہبی تعصّب اور جنون کی رُو سے نہیں کی جائے گی، عقل و فکر کی رُو سے کی جائے گی۔

اس کے بعد اگر مزید شہادات کی ضرورت ہے تو ان کی بھی دو ایک مثالیں سامنے لائیے۔ سنہ ۱۹۷۱ء کی مشرقی پاکستان کی جنگ کے بعد، سقوطِ ڈھاکہ کے المیہ جگر خراش پر شادیانے بجاتے ہوئے، بنگلہ دیش کے (اس وقت کے) قائمقام صدر، مسٹر نذرالاسلام نے اعلان فرمایا تھا کہ،

ہماری یہ فتح، نہ کسی فوج کی فتح ہے، نہ کسی ملک کی۔ یہ فتح ہے حق کی باطل پر۔ یہ فتح ہے، ایک صحیح نظریہ کی غلط نظریہ پر۔ تقسیم ہند سے پہلے، سرپھرے مسلمانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ قومیت کا مدار مذہب کا اشتراک ہے، وطن کا اشتراک نہیں، اور حکومت کی بنیاد مذہب پر ہے، سیکولر نہیں۔ ہزار ان لوگوں کو لاکھ سمجھایا گیا کہ یہ نظریہ غلط ہے اور ناممکن العمل

اس بیا اعتراف نہ کرو۔ لیکن وہ نہ مانے اور اپنے غلط مفروضہ کی بنیاد پر ایک جداگانہ قوم بن کر ایک الگ مملکت کے بانی بن گئے۔ لیکن چوبیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ جو نظریہ یہ لوگ پیش کر رہے تھے وہ باطل تھا اور حق وہی تھا، جو ان کے مخالفین پیش کر رہے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ نے اس حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ اب یہ شہادت، تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لئے منقوش رہے گی۔ ہم ان راہ گم کردہ لوگوں سے اب بھی کہیں گے کہ وہ اس باطل نظریہ کو ترک کر کے وطن کے اشتراک کی بنا پر پھر سے ہندوستانی قوم کا جزو بن جائیں اور مذہب کو سیاست میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کریں۔ ورنہ جو حشر آج مشرقی پاکستان کا ہوا ہے وہی کل مغربی پاکستان کا بھی ہوگا۔ حقائق کسی کے جھٹلائے، جھوٹے ثابت نہیں ہو جایا کرتے۔

اِدھر نذرالاسلام صاحب، یہ کہہ رہے تھے اور دوسری طرف (اُس زمانہ کی بھارت کی وزیرِ اعظم) مسز اندرا گاندھی، اپنی پارلیمان میں "فتح بنگالہ" پر ہدیۂ تبریک کے جواب میں یہ فرما رہی تھیں کہ،

چہ کامیابی، نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہی حکومت کی کامیابی، یہ کامیابی ہے، حق پر مبنی نظریہ کی، اس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا، مسلمانوں نے تحریک پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے۔ یہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ اب چوبیس سال کے تجربہ نے بتا دیا ہے کہ جو کچھ ہم کہتے تھے وہ حق تھا اور ان کا نظریہ باطل۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے۔

آپ سوچئے کہ اگر (معترضین کے قول کے مطابق) قائداعظمؒ نے اپنی ۱۱ اگست کی تقریر میں، خود ہی دو قوموں کے "باطل نظریہ" کی عمارت کو مسمار کر دیا تھا تو نذرالاسلام اور مسز گاندھی کو یہ کہنے کا بڑا اچھا موقعہ تھا کہ خود قائداعظمؒ نے اس باطل نظریہ کی اگست ۱۹۴۷ء میں تردید کر دی تھی لیکن اس قوم (پاکستان کے مسلمانوں) نے ان کی بات بھی نہ مانی، اور اپنی ضد پر اڑی رہی، جس کا نتیجہ اب ان کے سامنے آگیا ہے۔ انہوں نے بھی ایسا نہیں کہا جس سے واضح ہے کہ انہوں نے بھی قائداعظمؒ کی ۱۱ اگست کی تقریر سے وہ مفہوم نہیں لیا تھا جو مفہوم ہمارے گھر کے پاکستان دشمن افراد لے رہے ہیں۔ یہ حضرات اشتراکِ وطن کی بنا پر، پاکستان میں متحدہ قومیت کے فتنے بیدار کر رہے ہیں۔ اور خود ہندوستان میں آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنی قوم کو مشورہ دے رہے ہیں کہ دو قومی نظریہ ہندوستان میں بھی رائج کر دو۔ مسٹر نراد۔ سی۔ چوہدری ہندوستان کا، بین الاقوامی شہرت کا قلم کار ہے۔ اس نے ۱۹۶۸ء میں ایک مقالہ شائع کیا تھا جس میں لکھا تھا:-

میں یہ بات پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب دوبارہ کھل کر پورے شدومد سے، مجھے یہ کہہ لینے دیجئے کہ جب تک ہندوستان کی حکومت اور ہندوستان کے ہندو یہ رٹ لگاتے رہیں گے کہ یہاں کے مسلمان ایک متحدہ قومیت کا جزو ہیں، اس وقت تک ہندو مسلم فسادات کے مسئلہ کو سلجھایا ہی نہیں جا سکتا۔ . . . . . امرِ واقعہ یہی ہے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ معاشرے ہیں۔ جو دو الگ تہذیبوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے اندر یہ اختلاف ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ . . . . . اگر میری یہ بات مان لی جائے تو پھر اگلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ اسے تسلیم کر لیا جائے کہ ہندو اور مسلم دو الگ الگ قومیں ہیں۔ (طلوعِ اسلام۔ بابت جون ۱۹۶۹ء)

اور آخر میں ہم، خود اہلِ پاکستان میں سے، ان صاحب کی شہادت بھی پیش کئے دیتے ہیں، جو تحریکِ پاکستان کے مخالفین میں سے ہیں اور جو اب بھی بانیانِ پاکستان کے خلاف طعن و تشنیع کرتے رہتے ہیں۔ یعنی ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔

______ بات یوں ہوئی کہ (فسادات پنجاب کے سلسلہ میں) منیر انکوائری کمیٹی میں، قائدِ اعظمؒ کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر بھی زیرِ بحث آگئی۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے اپنا ایک بیان کمیٹی کو بھیجا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا:۔

قائدِ اعظمؒ کی اس تقریر کے الفاظ خواہ بظاہر پہلے اور دوسرے مفہوم کے حامل ہیں مگر ہمارے لئے یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ ان کا منشا بھی حقیقت میں وہی تھا جو ان کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ان کے رتبے کے انسان سے ہم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ پاکستان کے قیام سے پہلے دس سال تک جن اصولوں کو بنیاد بنا کر لڑتے رہے تھے، ان سے وہ پاکستان قائم ہوتے ہی یک لخت پلٹ گئے ہوں گے۔ اور انہی اصولوں کے قائل ہو گئے ہوں گے جن کے خلاف انہوں نے اپنی ساری قوم کو ساتھ لے کر جنگ کی تھی۔ نیز ہم یہ گمان بھی نہیں کر سکتے کہ وہ قیامِ پاکستان کے پہلے ہی دن یکایک اپنے ان تمام وعدوں سے پھر گئے ہوں گے جو انہوں نے بارہا صاف اور صریح الفاظ میں اپنی قوم سے کئے تھے اور جن کے اعتماد ہی پر قوم ان کو اپنا لیڈر مان کر اپنی جان و مال ان کے اشاروں پر قربان کرنے کے لئے آمادہ ہوئی تھی۔ پھر ہمارے لئے یہ ماننا بھی ممکن نہیں ہے کہ قائدِ اعظمؒ ایسی متضاد باتیں کر سکتے تھے کہ ۱۱ اگست کو ایک اعلان کریں اور پھر اس کے بعد بار بار اس کے بالکل خلاف باتوں کا مسلمان پبلک کو یقین دلاتے رہیں۔ اس لئے ہمارے نزدیک ان کی مذکورہ بالا تقریر کو ان کے اگلے اور پچھلے ارشادات کی روشنی میں سمجھنا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ ہم اس کا کوئی ایسا مفہوم لیں جو ان کی تمام باتوں کے خلاف پڑتا ہے جو انہوں نے اس سے پہلے فرمائیں، اور اس کے بعد بھی فرماتے رہے۔

سب کو معلوم ہے کہ قائدِ اعظمؒ کی کانگریس سے لڑائی تھی ہی دو قومی نظریئے کی بنیاد پر۔۔۔ ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء تک ان کا مستقل نظریہ یہ تھا کہ ______ مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور وہ غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک متحدہ وطنی قومیت نہیں بنا سکتے۔ اس کے متعلق ان کی بہت سی تحریروں اور تقریروں میں سے صرف ایک تحریر کا اقتباس میں یہاں نقل کروں گا جو ستمبر ۱۹۴۴ء میں گاندھی جی کے ساتھ اپنی خط و کتابت کے سلسلے میں لکھی تھی۔

اس کے بعد مودودی صاحب نے قائدِ اعظمؒ کی چٹھی کا اقتباس دیا تھا اور پھر لکھا تھا:۔

اب کیا ہم یہ باور کر لیں کہ ۱۱ اگست کو یک لخت وہ تمام خصوصیتیں مٹ گئیں جو مسلمانوں کو غیر مسلموں سے جدا کر کے ایک الگ قوم بناتی تھی۔ اور یکایک ایک ایسی نئی قومیت کے اسباب فراہم ہو گئے جس میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا جذب ہونا ممکن ہو گیا؟ اگر ہم اس بات کو مان لیں تو قائدِ اعظمؒ کو اس الزام سے بچایا نہیں جا سکتا کہ وہ ایک با اصول آدمی نہ تھے بلکہ محض سیاسی مصلحتوں کی خاطر اصول بناتے اور بدلتے رہتے تھے۔ مرحوم کی وفات کے پانچ سال بعد ان کی روح کو ایسے الزامات کا تحفہ پیش کرنے کے لئے میں تو کسی طرح تیار نہیں ہو سکتا۔

(بحوالہ ایشیا۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۷۰ء)

یہ ہے جو کچھ مودودی صاحب نے قائدِ اعظمؒ کی زیرِ بحث تقریر کے مفہوم کے متعلق کہا تھا ______ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں انہوں نے خود ہی نظامِ جمہوریت، کو عین مطابق اسلام قرار دے دیا جس میں امورِ مملکت کے فیصلے ملک کی (مسلم اور غیر مسلم آبادی کی) اکثریت کی رو سے ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۶۲ء کے آئین کے تحت ہونے والے انتخابات کے سلسلہ میں فرمایا تھا کہ

اگر کنونشن مسلم لیگ کسی فرشتے کو بھی امیدوار کھڑا کرے تو جماعت اسلامی اس کی حمایت نہیں کرے گی۔ کیونکہ ہمیں اس کے اصولوں سے اتفاق نہیں۔ اس کے برعکس اگر ایک ہندو، جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اسے میری تائید حاصل ہوگی، اس لئے کہ اس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریہ کے مطابق

ہونا چاہیئے تھا۔

(طلوعِ اسلام - نومبر ۱۹۸۴ء - صفحہ)

یہ ہے دو قومی نظریہ کے متعلق قائداعظمؒ کے دعاوی اور مسلک کی وضاحت۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ وہ، تحریکِ پاکستان کے یومِ اوّل سے لے کر اپنی زندگی کے آخری سانس تک اس نظریہ کے حامی رہے، یہ اس لئے کہ وہ اسے اسلام کا بنیادی اور مملکتِ پاکستان کے جواز کی خشتِ اول سمجھتے تھے۔

لیکن ہم، ان حضرات کی خدمت میں، جو ان تمام تصریحات کے باوجود، اپنی ضد پر اڑے رہنا چاہتے ہیں۔ (کہ قائداعظمؒ نے اپنی ۱۱ راگست ۱۹۴۷ء کی تقریر میں اس نظریہ کا ابطال کر دیا تھا) ایک گذارش کرنا چاہتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ فرض کر لیجئے کہ (جیسا کہ آپ کہتے ہیں۔ اور بالکل غلط کہتے ہیں) قائداعظمؒ نے اس نظریہ سے رجوع کر لیا تھا، تو اس سے اصل حقیقت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ جیسا کہ ہم شروع میں بتا چکے ہیں' دو قومی نظریہ، اسلام کا بنیادی اصول ہے۔ ہم ان حضرات سے پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ کیا آپ اسے اسلام کا اصول مانتے ہیں یا اس سے بھی انکار کرتے ہیں؟ اگر آپ اسے اسلام کا اصول تسلیم کرتے ہیں تو یہ سوال درخورِ اعتنا ہی نہیں ہونا چاہیئے کہ کس نے اسے قبول کیا اور کس نے مسترد کر دیا۔ اور اگر آپ اسے اسلام کا اصول تسلیم نہیں کرتے تو پھر آپ کو اپنے اس عقیدہ کی تائید میں قائداعظمؒ کو بطورِ سند پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ قائداعظمؒ کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے اور صاف صاف بات کیجئے کہ آپ دو قومی نظریہ کو مطابقِ اسلام سمجھتے ہیں یا متحدہ قومیت کو؟ اس لئے کہ مملکتِ پاکستان کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اور آئین میں بھی اسے "اسلامی" کہہ کر پکارا گیا ہے اس لئے یہاں' امورِ مملکت سے متعلق تمام باتیں' اسلام کے حوالے سے ہونی چاہئیں۔ فرمایئے! اسلام کے حوالے سے اس باب میں آپ کا کیا مسلک ہے؟

لیکن ہمیں ان سے کیا گلہ ہے جبکہ خود ان حضرات نے جن کے ہاتھ میں پاکستان کی زمامِ اقتدار رہی ہے' دو قومی نظریہ سے عملاً انحراف برتا ہے۔ پاکستان میں اس وقت تک تین آئین بن چکے ہیں۔ ان میں سے کسی آئین میں بھی' پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو الگ قوم قرار نہیں دیا گیا۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں' دونوں کو پاکستانی قوم کے افراد شمار کیا گیا ہے۔ ۱۹۷۳ء کے آئین پر تو تمام پارٹیوں کے پارلیمانی نمائندوں نے دستخط کئے تھے۔ جب علمبردارانِ پاکستان کی خود اپنی یہ کیفیت ہے تو پاکستان سے بغض اور عداوت رکھنے والوں سے کیا گلہ!

لیکن یہ ہوں یا وہ۔ جو بھی دو قومی نظریہ کی مخالفت کرے گا وہ کسی صورت میں پاکستان کا بہی خواہ قرار نہیں پا سکتا۔ اس مملکت کی وجۂ جواز دو قومی نظریہ اور قرآنی نظامِ خداوندی کا قیام ہے۔ ان میں سے کسی ایک سے بھی انکار یا انحراف' مملکت کے خلاف بغاوت کے مترادف ہے۔

؎ یہ اور بات ہے کہ مودودی صاحب پہلے فرما چکے ہیں کہ اسلامی ریاست میں "جو اسمبلی شوریٰ کے لئے منتخب کی جائے گی اس میں بھی اہلِ ذمہ کو رکنیت یا رائے دہندگی کا حق نہیں ملے گا"۔ (اسلامی ریاست ۱۹۶۷ء ایڈیشن۔ صفحہ ۵۲۵)۔ ان کا اسلام' مجموعۂ اضداد ہے!

ضروری وضاحت

یہ خطاب سنہ ۱۹۷۴ء میں پیش کیا گیا تھا اس میں جن ایسی شخصیتوں کا ذکر آگیا ہے جو اب مرحوم ہو چکی ہیں ان کے نام کے ساتھ (مرحوم) کا اضافہ کر لیا جائے۔

(طلوع اسلام)

قارئین طلوع اسلام کے لئے مژدہ!

مفکر قرآن کے بلند پایہ شاہکار "معراج انسانیت" کے تازہ ایڈیشن کی طباعت کیلئے کاپیاں پریس کو بھیج دی گئی ہیں۔ قارئین اپنی فرمائشیں بھیج دیں تاکہ ادارہ علی الترتیب انکی تعمیل کر دے۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

رشتہ مطلوب ہے

نہایت معزز شریف، خاندان کی سلیقہ شعار دوشیزہ جس کی عمر قریب چوبیس سال ہے اور جو ہفتہ ایم (کالج) کی طالبہ ہے، موزوں رشتہ درکار ہے۔ نمود و نمائش، فضول رسمیات اور گراں بار مطالبات سے احتراز ضروری ہے۔

خط و کتابت بصیغہ راز

(ط ۲۵) معرفت ادارہ طلوع اسلام ۲۵/بی گلبرگ II لاہور

خریدار صاحبان متوجہ ہوں

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

(۱) بسا اوقات ادارہ ہذا کے نام جو منی آرڈر موصول ہوتے ہیں ان کے کوپنز (COUPONS) پر خریدار کا مکمل پتہ نہیں لکھا ہوا ہوتا۔ اس کا خاص خیال رکھا جائے تاکہ تعمیل میں بلا وجہ تاخیر نہ ہو۔

(۲) پرچہ نہ ملنے کی اطلاع خریدار ماہ رواں کی پندرہ تاریخ تک بھیج دیں۔ اس صورت میں ہی پرچہ دوبارہ ارسال کیا جائے گا۔

(۳) جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ ارسال کریں۔ (ناظم ادارہ طلوع اسلام)